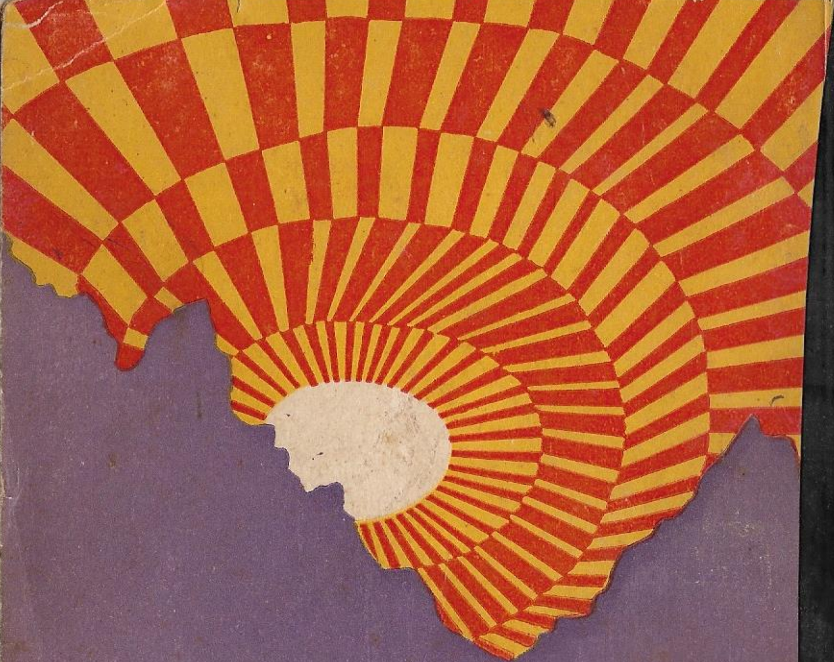

ہمارا بلوچستان

ش ضحیٰ

ہمارا بلوچستان

ش۔ ضحیٰ

جملہ حقوق بحق سید شوکت ضحیٰ خلف اکبر ش۔ ضحیٰ محفوظ ہیں

مرتبہ	:	کامل القادری
ناشر	:	سید فصیح اقبال
طابع	:	انجمن پریس - کراچی
کتابت	:	شمس الحق
تزئین	:	محمد اشفاق
تعداد	:	ایک ہزار
پہلی بار	:	اکتوبر ۱۹۷۲ء

بولان بک کارپوریشن

جناح روڈ ——— کوئٹہ

سعید چیمبرز ، ناظم آباد - کراچی

قیمت : تین روپے

نجم الہدیٰ

ترتیب

اُبھرتا سورج	۵
ش۔ ضحیٰ	۱۰
ہمارا بلوچستان	۱۳
بلوچستان کے باشندے	۲۸
بلوچستان قدیم کی جھلک	۴۶
بلوچستان کی ہیئتی حیثیت	۶۱
حصہ منظومات	۸۹
سانیٹ	۱۱۰

کامل القادری

اُبھرتا سورج

اربابِ علم و دانش کو یہ احساس کہاں ہوا کہ ۱۳ر جنوری ۱۹۶۹ء کی سولہ شب میں کس نے اپنا چہرہ چھپا لیا! نصف النہار تک پہنچنے سے پہلے کیسا سورج ڈوب گیا!! اغبار آلود مطلعِ علم و ادب سے گزر کر آگے جانے والی نگاہیں کمیاب تھیں اور وہ ایک اُبھرتا سورج تھا ——— شمس الضحیٰ! کبھی کبھی رسائل و جرائد میں اس کی تخلیق و تحقیق کی کچھ ضوفشاں جھلکیاں تو سامنے آئیں اور دیکھنے والی نگاہوں کو یہ اندازہ ہوا کہ کتنا کشیدہ قامت تھا لیکن اس کی علمی و ادبی شخصیت اور اس کے مرتبہ و مقام کا تعین چند جھلکیوں سے ممکن بھی نہ تھا، اس کے کلام کے پانچ سات مجموعے (جو اپنی زندگی میں وہ مرتب کر گیا ہے) اور بلوچستان پر اس کی بیش بہا تحقیقات اور تفسیریں وہ خطوط جو اس کے شوقِ انشا پردازی کی یادگار ہیں، اور

شمس الضحیٰ - گورنمنٹ کالج کوئٹہ کے منعقدہ جشنِ اقبال میں وزیرِ تعلیم فضل الرحمٰن کے ساتھ

ساتھ ہی دوسرے علمی و ادبی مضامین نظم و نثر اسی ابھرتے سورج کی وہ کرنیں ہیں جو سامنے نہ آسکیں۔

ش۔ ضحیٰ شاعر بھی تھے، ادیب بھی اور محقق بھی اور برصغیر و پاک میں وہ گمنام بھی نہ تھے، ان کی شاعری میں جو تازگی، غنائیت، تخیّل کو تمثال بنا دینے کی کیفیت اور روحِ عصر کی تھرتھری پائی جاتی ہے، اس کی مثالیں قدیم و جدید دبستانِ شاعری میں اگر نایاب نہیں تو کمیاب ضرور ہیں۔

اردو میں سانیٹ لکھنے میں پہل قاضی اختر میاں جوناگڑھی نے کی، پھر اختر شیرانی نے اس صنف کو حسن و خوبی سے اپنایا، ان کے نامور شاگرد راشد نے بھی ابتدا میں چند سانیٹ لکھے، بعض دوسرے شعراء نے بھی طبع آزمائی کی ہوگی، لیکن ش۔ ضحیٰ نے جب اسے اپنایا تو یہ کیفیت ہوگئی۔

آبگینہ تندیِ صہبا سے پگھلا جائے ہے

یہاں ہیئت فکر میں ڈھل گئی ہے۔ ہم اگر ش۔ ضحیٰ کی قومی شاعری، انشائی ادب، وضعِ اصطلاحات، تحقیقی مقالات اور تقریبیں سے آنکھیں چرا بھی لیں تو ان کے سانیٹ کا ایک مجموعہ ہی ان کو بقائے دوام بخشنے کیلئے کافی ہوگا۔

ش۔ ضحیٰ کو بلوچستان سے ایک والہانہ لگاؤ تھا۔ انہوں نے بلوچستان کی روح کو برافگندہ نقاب دیکھا تھا اور اس کے جلوہ ہائے رنگ رنگ کو اپنی شاعری میں سمویا تھا۔ پھر انہوں نے بلوچستان کی جغرافیائی سرگزشت اور اس کے پس منظر میں تاریخی عوامل پر محققانہ نظر ڈالی تھی۔ اور اس طرح

بلوچستان کی آواز بن گئے تھے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ بیس بائیس برس پہلے بلوچستان کے بارے میں جب ان کے چند مضامین شائع ہوئے تو لوگ چونک اٹھے اور جب ان کے تحقیقی مقالے کی ایک فصل PYSIOGRAPHICAL PERSONALITY OF BALUCHISTAN پاکستان جوگرفیکل ریویو میں شائع ہوئی تو یورپ اور امریکہ کے محققوں میں بھی ان کا نام احترام کے ساتھ لیا جانے لگا اور اس مقالے کو ہارورڈ یونیورسٹی کے علاوہ یورپ اور امریکہ کی دوسری یونیورسٹیوں نے اپنے اہم مآخذ میں شمار کیا۔ جس کے معنی یہ ہیں کہ اب بلوچستان کے سلسلے میں کوئی تحقیق ہوگی تو اس مقالے کی حیثیت قطب نما کی ہوگی۔

بلوچستان پر قدیم و جدید تمام مصنفین کی جتنی کتابیں شائع ہوچکی ہیں، راقم السطور نے سب کو بامعانِ نظر دیکھا ہے، اور یہ بات بلا خوفِ تردید کہی جاسکتی ہے کہ بلوچستان کی اصل روح تک پہنچنے میں ش۔ ضحیٰ کی کوششیں گزشتہ کئی صدیوں کی تحقیقی فہرست میں یکتا و یگانہ ہیں اور میں نے انہیں ابھرتا سورج محض نام کی رعایت سے نہیں بلکہ یوں بھی کہا ہے کہ اس کی کرنیں آئندہ بھی شاید صدیوں تک روشنی دکھاتی رہیں۔ ممکن ہے کہ اب اس گراں قدر تحقیقی کتاب کو منظرِ عام پر لانے کی سعادت جامعۂ بلوچستان کے حصے میں آئے۔

زیرِ نظر تالیف ش۔ ضحیٰ کے چار مضامین، نو نظموں اور دس سانیٹ پر مشتمل ہے۔ تین مضامین ——— "ہمارا بلوچستان"، "بلوچستان

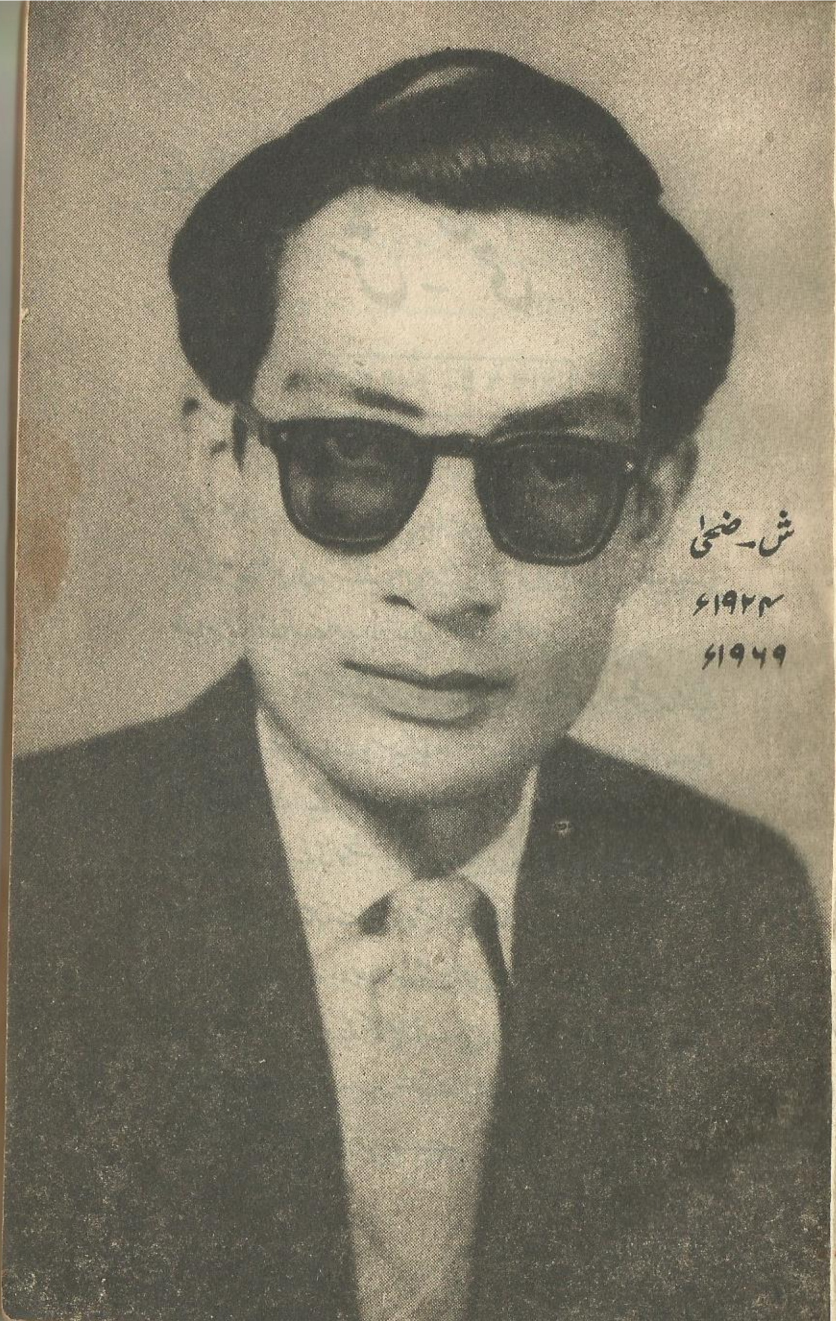

ش۔ ضحیٰ
۱۹۲۴ء
۱۹۶۹ء

کے باشندے"، اور "بلوچستان قدیم کی ایک جھلک" کے عنوان سے "ماہِ نو" کراچی میں بیس سال پہلے شائع ہوتے تھے، جو آج بھی تازہ ہیں۔ چوتھا مقالہ

PHYSIOGRAPHICAL PERSONALITY OF BALUCHISTAN.

"پاکستان جاگریفیکل ریویو" لاہور میں شائع ہوا تھا۔ میں نے اس مقالے کا ترجمہ خود کرنا چاہا تھا لیکن یہ سعادت ش۔ ضحیٰ کے چھوٹے بھائی نجم ناظری کے حصّے میں آئی۔ انہوں نے اس اہم مقالے کا بڑا ستھرا ترجمہ کیا ہے۔ یہ انگریزی مقالہ تو قدرِ اوّل کی چیز ہے ہی، اہلِ نظر اس کے اردو ترجمے کو بھی اردو علمی سرمائے میں ایک بیش بہا اضافہ قرار دیں گے۔ یوں بھی درسی کتب کی تالیفات کے ماسوا جغرافیہ پر اردو میں دھرا ہی کیا ہے۔

اِن مضامین کے علاوہ اس تالیف میں نظم اور سانیٹ بھی شامل ہیں، مگر یہ ش۔ ضحیٰ کے کلام کا انتخاب نہیں، یہ ان چیزوں میں سے چند ہیں جو کوئٹے کے دورانِ قیام ان کے ذہنِ رسا پر نازل ہوئی تھیں اور اس تالیف کے مزاج کے مطابق ہیں۔ یہ کتاب ش۔ ضحیٰ کی علمی و ادبی شخصیت کا ایک پرتو ہے، ان کی پوری شخصیت ہمارے سامنے جب آئے گی کہ ان کی تمام تصانیف نظروں کے سامنے ہوں۔ اس کتاب کی اشاعت کا کوئی جواز نہیں، الّا۔

ترے فراق کے صدمے جو بڑھنے لگتے ہیں
نئے خیال، نئے دھیان گڑھنے لگتے ہیں

نجم ناظری

ش۔ ضحیٰ

۱۹۲۴ء - ۱۹۶۹ء

ش۔ ضحیٰ کا اصل نام شمس الضحیٰ تھا۔ ۲۰ر جولائی ۱۹۲۴ء کو، مظفر پور (بہار) میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم مظفر پور ضلع اسکول میں مکمل کی۔ ۱۹۴۰ء میں میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ ضلع کے مسلمان طلباء میں اوّل آئے اور دو سالہ وظیفہ حاصل کیا۔

۱۹۴۰ء تا ۱۹۴۴ء پٹنہ کالج، پٹنہ یونیورسٹی میں زیر تعلیم رہے یہیں سے بی۔ اے پاس کیا۔ اسی سال جغرافیہ میں ام۔ اے کے لئے علیگڈھ چلے آئے۔ ۱۹۴۶ء میں ام۔ اے کرنے کے بعد اعلیٰ تعلیم کے لئے بیرون ہند جانے کی کوششیں تقسیم سے قبل کی ہنگامہ آرائیوں کی نذر ہوگئیں۔ قیام پاکستان سے چند ماہ قبل ہجرت کی اور کراچی آ گئے۔

یہاں سے چند ماہ بعد، ۱۹۴۷ء ہی میں، سینڈمن ہائی اسکول، کوئٹہ میں معلمی قبول کر لی اور کوئٹہ چلے آئے۔ یہی اسکول بعد میں گورنمنٹ کالج کوئٹہ، میں تبدیل ہوگیا۔ جہاں شعبۂ جغرافیہ کے سربراہ کی حیثیت سے ش۔ ضحیٰ ۱۹۵۴ء تک کام کرتے رہے۔

مگر بابائے اردو مولوی عبدالحق کی دعوت پر اردو کالج کراچی کی تدریسی خدمات کیلئے بہتر سرکاری ملازمت چھوڑکر ۱۹۵۴ء میں کراچی آگئے۔ بعدہٗ جامعہ کراچی کے شعبۂ جغرافیہ سے ۱۹۶۲ء تک منسلک رہے۔ اور جب جامعہ کراچی میں، شعبۂ تصنیف وتالیف وترجمہ از سر نو منظم کیا گیا تو انہیں مدوگار ناظم کی ذمہ داریاں سونپ دی گئیں۔ جنہیں تادم واپسیں بطریق احسن انجام دیتے رہے۔ ان کا انتقال ۱۳ر جنوری ۱۹۶۹ء کو کراچی میں ہوا۔

ش۔ ضحیٰ ایک اعلیٰ علمی گھرانے میں پیدا ہوئے۔ بہار کے مشہور بزرگ اور صوفی، شاہ شرف الدین یحییٰ منیری سے آپ کو جدی نسبت ہے۔ آپ کے اجداد میں کئی نام ایسے ہیں، جو اپنے اپنے تبحر علمی کی بدولت پہچانے گئے ہیں۔

شعر وشاعری سے آپ کی دلچسپی خاندانی ورثہ ہے۔ لیکن آپ کے والد سید محمد مجتبیٰ، اپنی قانونی اور سیاسی مصروفیات کے باوجود، ش۔ ضحیٰ کی ادبی نشوونما کے اصل معمار ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ ابتدا میں اپنے چھوٹے چچا نسیم ندوی (مرحوم) کے کلام سے متاثر ہوتے۔ پھر مولوی خورشید الحسن مرحوم (والدگرامی علامہ جمیل مظہری) کی قربت نے جلادی۔ انگریزی ادب کے مطالعے نے غزل سے نظم کی جانب متوجہ کردیا۔ ش۔ ضحیٰ نے اپنی نظموں میں کئی تکنیکی تجربے کئے۔ اور وہ اس میں کامیاب رہے۔ انہوں نے کئی سو نظمیں لکھیں جن میں "سانیٹ" شامل ہیں۔

اپنی طالب علمی کے دوران، جب ش۔ ضحیٰ انگریزی آنرز کے

طالب علم تھے، پروفیسر کلیم الدین احمد، اور پروفیسر فضل الرحمٰن نے انہیں بے حد متاثر کیا۔ علیگڑھ کے قیام کے دوران، جغرافیہ کے نامور اساتذہ ڈاکٹر قاضی سعید الدین احمد اور ڈاکٹر مظفر احمد (بھارت) نے ان کی رہنمائی کی۔

ش۔ ضحیٰ اردو اور انگریزی کے علاوہ فارسی، عربی اور ترکی بھی جانتے تھے۔ جس نے ان کے لئے ادبی اور دیگر علمی ماخذ کے مطالعے کو آسان بنادیا۔ جغرافیہ، اردو اور انگریزی ادب کے علاوہ، نفسیات، تاریخ، فلسفہ اور لسانیات ان کے محبوب مضامین تھے۔ دفتری ذمہ داریوں کے تحت ان کا علمی تعلق جملہ چوبیس مضامین سے تھا جن کی تدریس جامعہ کراچی میں ہوتی ہے۔

ش۔ ضحیٰ عملی سیاست سے ہمیشہ دور رہے مگر مسلمانان ہند کی سیاسی جدوجہد سے بے حد متاثر ہوتے۔ ان کی بے شمار نظمیں ان کے ان تاثرات کی باعث "دو آتشہ" بن گئی ہیں۔

ش۔ ضحیٰ نے بلوچستان کو اپنا گھر بنالیا تھا۔ اور اسی احساس نے انہیں بلوچستان پر مفصل تحقیقی کام کیلئے اکسایا۔ ان کا تحقیقی مقالہ ابھی غیر مطبوعہ ہے۔

انہوں نے اپنی مختصر زندگی کو، اپنے نازک احساسات، انتھک محنت، اور وسیع مطالعہ سے "نقشِ دوام" بنانے کی بھرپور کوشش کی۔

ہمارا بلوچستان

اگر آپ کراچی سے مغرب کی سمت بحر عرب کے کنارے کنارے چلنا شروع کردیں تو تقریباً پانچ سو میل بعد آپ پاکستان کے آخری ساحلی مقام "گوتر" پہنچ جائیں گے۔ یہاں سے شمال کی جانب مڑ جایئے تو آپ کے دائیں بلوچستان اور بائیں ایران ہوگا۔ پہلے دائیں طرف ایک قوس بناتے ہوئے کوئی دو سو میل تک چلے جایئے۔ پھر سیدھے چلتے ہوئے قریباً سوا سو میل کا فاصلہ اور طے کیجئے۔ اس کے بعد بائیں طرف گھوم کر چلنے سے آپ کوہ مالک سیاہ پہنچ جائیں گے۔ اس طرح آپ جو خط بنائیں گے وہ بلوچستان کی مغربی سرحد کا خط ہوگا جس کی مجموعی لمبائی ۵۲۰ میل ہوگی۔ اب اگر آپ مشرق کی سمت مڑ جائیں تو ریگستانوں، وادیوں اور کوہساروں کو عبور کرکے قریباً ساڑھے سات سو میل بعد کوہ سلیمان کے شمالی سرے پر، کجوری کچھ پہنچ جائیں گے۔ جو دریائے گومل کے کنارے واقع ہے۔ یہ ہے بلوچستان کی شمالی سرحد۔ اس کو دو غیر مساوی حصوں میں تقسیم کر دیجئے۔ پہلا حصہ سوا سات سو

میل مشرق کی جانب، دو منڈی سے کجوری کچ تک بلوچستان کو صوبہ سرحد سے جدا کرے گا۔

کجوری کچ سے جنوب کا رُخ کیجیے۔ کوہ سلیمان کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے قریباً ساڑھے تین سو میل کے بعد آپ جیکب آباد کے قریب پہنچ جائیں گے۔ کوئی چالیس میل کا فاصلہ اور طے کر کے کوہ کیرتھر کے ساتھ ساتھ چلنا شروع کر دیجیے تو دو سو میل کے بعد آپ راس مونزے میں بحرِ عرب کی موجوں کو چھو لیں گے۔

جنوب، مغرب، شمال اور مشرق کی ان سرحدی خطوط میں جو سرزمین گھرے گی۔ وہ ہمارا بلوچستان ہوگا۔ اس وسیع وعریض علاقے کے تین جزو ہیں۔ ایک وہ جو تقسیم ہند سے پہلے "برطانوی بلوچستان" کہلاتا تھا۔ اس کا رقبہ ۹،۴۷۶ مربع میل ہے۔ دوسرا "ایجنسی مقبوضات" کہلاتا تھا۔ اس کا رقبہ ۴۴،۳۴۵ مربع میل ہے۔ تیسرے میں بلوچستان کی ریاستیں یعنی قلات، خاران، مکران۔ اور لاس بیلہ شامل ہیں۔ جن کا مجموعی رقبہ ۷۸،۰۳۴ مربع میل ہے۔ ان سب کو ملا کر بلوچستان کا کل رقبہ ۱۳۱،۰۵۵ مربع میل ہوتا ہے۔ مغربی پاکستان کے تمام صوبوں اور ریاستوں کا مجموعی رقبہ تین لاکھ ساڑھے تین ہزار مربع میل ہے۔ اس کا مقابلہ بلوچستان کے رقبہ سے کیجیے تو معلوم ہوگا کہ بلوچستان، مغربی پاکستان کا ۴۳ فی صدی ہے اور پورے پاکستان کا کم وبیش ۳۶ فی صدی! یا یوں سمجھئے کہ ہمارے پاکستان

کا یہ واحد خطہ رقبے میں جزائر برطانیہ سے بھی زیادہ ہے۔

مغربی پاکستان میں چار صوبے اور متعدد ریاستیں شامل ہیں۔ لیکن قدرتی لحاظ سے اس کے صرف دو حصے ہیں۔ ایک پنجاب اور سندھ کا دریائی میدان اور دوسرا شمال مغرب کا کوہستانی علاقہ۔ یہ دوسرا علاقہ درحقیقت جنوبی مغربی ایشیا کی اس عظیم الشان سطح مرتفع کا ایک جزو ہے جسے "ایرانی پلیٹو" کہتے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں پامیر سے بحرِ عرب کے ساحل تک اور سلیمان و کیرتھر سے لے کر آرمینیا تک کی ساری سرزمین ایک مستقل وحدت ہے۔ اس کے جنوب مغرب میں دجلہ اور فرات اور مشرق میں سندھ کی وادی ہے۔ یہ وادیاں یوں تو الگ الگ ہیں لیکن ان میں ایک بات مشترک بھی ہے۔ یہ دونوں وادیاں انسانی تاریخ، تہذیب اور تمدن کا گہوارہ رہ چکی ہیں۔ بلکہ یہ کہنا زیادہ صحیح ہوگا کہ یہ دونوں وادیاں ایک ہی تہذیب کے دو ہم عہد رُخ پیش کرتی ہیں۔ بعید شمال میں ترکستان کا نشیبی میدان بھی ایک تاریخی اور تہذیبی گہوارہ کی حیثیت رکھتا ہے۔

ان امور کی روشنی میں بلوچستان پر نظر ڈالئے تو اس کی اہمیت خود بخود واضح ہو جائے گی۔ یہ علاقہ تاریخ اور تہذیب کے مختلف گہواروں کے درمیان کچھ اس طرح واقع ہے کہ خود بھی ایک گہوارہ بن گیا ہے۔ صرف یہی نہیں بلکہ بلوچستان ایک گہوارے کو دوسرے سے ملا بھی دیتا ہے۔ اس ملاپ کے لئے درۂ بولان درۂ مولا اور مکران کا ساحل دروازوں اور راستوں

کاکام دیتے ہیں ان راہوں سے قدیم مقدونی۔ ایرانی۔ عرب۔ غزنوی۔ غوری منگولی اور درانی گذرے ہیں۔ وادیٔ سندھ سے اُٹھنے والی تاریخی موجوں نے بھی بلوچستان کو اپنی رہگذر بنایا ہے۔ غرض ہمارا یہ مغربی صوبہ ایشیا کی تاریخ اور تہذیب کا ایک عظیم سنگم ہے اور مستقبل میں بھی ایسا ہی رہے گا۔ آیئے ہم اس کے قدرتی خدوخال کا جائزہ لیں۔

شمال مشرق میں دریائے گومل سے لے کر ڈھائی سو میل جنوب تک شانہ بشانہ کئی پہاڑی سلسلے ملتے ہیں جنہیں مجموعی طور پر کوہِ سلیمان کہا جاتا ہے۔ اس کی اوسط بلندی چھ سات ہزار فٹ ہوگی لیکن اس کی سب سے اونچی چوٹی "تخت سلیمان" گیارہ ہزار فٹ ہے۔ جو بلوچستان کے عین شمال مشرق میں ہے۔ آس پاس کی تمام بلندیوں پر چلغوزے اور زیتون کے گھنے جنگل پائے جاتے ہیں۔ کوہِ سلیمان کو ایک فلک بوس اور آہنی فصیل سمجھئے جسے عبور کرنا دشوار ہی نہیں بلکہ ناممکن ہے۔ آمد و رفت اور رسل و رسائل کے لئے چند درے ضرور ہیں لیکن ہر درہ اتنا تنگ اور پرپیچ ہے کہ اس سے خاطر خواہ فائدہ نہیں اٹھایا جاسکتا۔ موسم سرما میں کوہ سلیمان کی بلندیوں پر برف کی موٹی تہہ جمی رہتی ہے۔ بہار شروع ہوتے ہی یہ برف پگھلتی ہے تو ندی نالوں میں طغیانی آجاتی ہے۔ یہ ندی نالے کوہِ سلیمان کے دروں اور وادیوں سے گذرتے ہیں اور طغیانی کی حالت میں ان کا دھارا اتنا تیز ہوتا ہے کہ بڑی سے بڑی چٹانیں بھی آن کی آن میں بہہ جاتی ہیں۔

جہاں کوہِ سلیمان کا سلسلہ ختم ہوتا ہے وہاں سے کچھ مغرب کی طرف ہٹ کر ایک دوسرا سلسلہ شروع ہوتا ہے جسے کرتھار یا کیرتھر کہتے ہیں کراچی کے مغربی مضافات میں جو پست پست پہاڑ نظر آتے ہیں وہ اسی کی اِدھر اُدھر مڑی ہوئی شاخیں ہیں۔ اس کا سلسلہ راس مونزے یا راس مواری تک چلا گیا ہے۔ اس کی لمبائی قریباً دو سو میل اور چوڑائی ساٹھ میل ہے۔ اور بلندی کوہ سلیمان سے بہت کم ہے۔ اس کی بلند ترین چوٹی "زردق" ساڑھے سات ہزار فٹ ہے۔ ایک اور چوٹی جس کا عجیب و غریب نام "کتے کی قبر" ہے۔ سات ہزار فٹ بلند ہے۔ کیرتھر پر چلغوزے یا زیتون کا جنگل تو درکنار کوئی درخت بھی نہیں ملتا۔

کیرتھر کے مغرب میں کوہِ پب کے متوازی سلسلے ہیں جن کے درمیان لانبی لانبی مسطح وادیاں ہیں۔ ان میں سے ایک لاس بیلہ ہے۔ راس مونزے کے بعد کوہ کیرتھر اور یہ ثانوی سلسلے مغرب کی طرف خم کھا کر ساحل کے ساتھ ساتھ دور تک نکل گئے ہیں اور مکران کا ساحلی کوہستان کہلاتے ہیں، مٹی، ریت اور رکاز آمیز طباشیر سے مرکب یہ سلسلہ بلوچستان کے ساحل پر ۲۸۰ میل تک پھیلا ہوا ہے۔ قدم قدم پر کھاتیاں اور درے ہیں۔ آپ کو ان پہاڑوں پر نہ سبزہ ملے گا، نہ پانی اور نہ ان کے دامن میں قابلِ ذکر انسان بستیاں ہی نظر آئیں گی۔

اس سلسلے کو یہیں چھوڑتے اور شمال کی طرف نظر دوڑائیے۔

شمال مشرق میں درۂ گومل سے ایک سلسلۂ کوہ نمودار ہوتا ہے جو بتدریج بلند اور کچھ ٹیڑھا ہوتا ہوا مغرب کی سمت چلا گیا ہے۔ گومل کے پاس مشرق میں اس سلسلے کی بلندی صرف پانچ ہزار فٹ ہے لیکن مغربی سرے پر یہ بلندی دس ہزار فٹ تک پہنچ جاتی ہے۔ اس سے کچھ پرے کند نام کی ایک چوٹی ہے جو گیارہ ہزار فٹ بلند ہے۔ گومل سے لے کر کند تک کا یہ سلسلہ بلوچستان کو افغانستان سے قدرتی طور پر علیحدہ کر دیتا ہے۔ اس بلند خطے کو "کاکر خراسان" کہتے ہیں۔ کند سے مغرب کی طرف یہی سلسلہ بتدریج پست ہوتا ہوا چمن تک چلا گیا ہے۔ چمن، کوئٹہ سے ۹۰ میل شمال مغرب کی سمت بلوچستان اور افغانستان کی سرحد پر واقع ہے۔ چمن سے یہ سلسلہ اچانک جنوب کی سمت مڑ جاتا ہے اور خواجہ عمران و سرلٹھ کے نام سے موسوم ہو کر مکران کے وسطی سلسلے میں ضم ہو جاتا ہے۔ بلوچستان کی اس شمالی سرحد کے مغربی وسط میں ایک اور طویل سلسلۂ کوہ واقع ہے جس کو "چاغی" کہتے ہیں۔ اس کی خاص چوٹیاں ماران۔ ملک تیرزان اور ملک نارو کہلاتی ہیں۔ ہر چوٹی سات ہزار فٹ سے بھی زیادہ بلند ہے۔ کچھ آگے چل کر یہی سلسلہ کئی آتش فشاں پہاڑوں میں بٹ گیا ہے۔ ان میں سے ایک کوہ سلطان ہے۔ جو اب مردہ ہے۔ اس کے تین دہانے ہیں۔ اس کی ایک اور قابل ذکر بات یہ ہے کہ اس میں ایک ستون ہے جو تین سو فٹ موٹا اور آٹھ سو فٹ لمبا ہے۔ اسے "نیزۂ سلطان" کہتے ہیں۔

چاغی کے جنوب میں ایک دوسرا سلسلہ راس کوہ کہلاتا ہے۔ دراصل یہ اس سلسلہ کی بلند ترین چوٹی ہے۔ اس کے جنوب میں شمر قاغر یا سیاہان کا سلسلہ ہے اور پھر وسطی مکران اور ساحلی مکران کے متوازی سلسلے ہیں۔ ان میں سے ہر ایک خشک، بنجر اور غیر آباد ہے۔

مندرجہ بالا سلسلوں کے علاوہ وسط میں بھی کئی آڑے ترچھے سلسلے آپس میں مل گئے ہیں جو وسطی براہوی سلسلہ کہلاتے ہیں۔ صوبے کی تمام بلند چوٹیاں اسی میں پائی جاتی ہیں۔ مثلاً خلیفت۔ زرغون۔ تکاتو وغیرہ۔ ہر چوٹی گیارہ ہزار فٹ سے بھی زیادہ بلند ہے۔ کوئی سلسلہ چھ ہزار فٹ سے کم نہیں۔ بولان کا مشہور درہ اسی کے مشرقی پیچ و خم میں واقع ہے۔ اس سے کچھ جنوب کی سمت درۂ مولا ہے۔ یہ وہی درہ ہے جس سے سکندر اعظم کی فوج کا ایک دستہ یونان واپس گیا تھا۔

اگر آپ بلوچستان کے اس کوہستانی پیچ و خم کو مدنظر رکھیں تو آپ کو سارا بلوچستان بے شمار وادیوں اور مسطح میدانوں میں منقسم نظر آئے گا۔ شمال مشرق میں وادی ژوب اور لورالائی۔ شمال میں پشین اور وسط میں وادیٔ شال ہے جسے کوئٹہ کہتے ہیں۔ شال کی ایک جانب شاہرگ۔ دوسری جانب شورارود۔ جنوب مشرق میں لاس بیلہ اور مغرب میں چاغی، دالبندین، خاران، کولوا، کیچ، پنجگور اور دوسری مکرانی وادیاں ہیں۔ یہ پہاڑوں میں گھری ہوئی وادیاں وہ خلوت گاہیں ہیں۔ جن میں بلوچستان کی زندگی انگڑائیاں

لیتی ہے۔ ان میں سکون بھی ہے اور اضطراب بھی، رزم بھی ہے اور بزم بھی۔ ان کے باشندے۔ بلوچی اور بروہی۔ تہذیب اور شائستگی سے بیگانہ کہے جاتے ہیں لیکن اس کے باوجود وہ خود ایک ایسی تاریخ پیش کرتے ہیں جو معصومیت اور جرأت کا بہترین نمونہ کہلا سکتی ہے۔

بلوچستان کے باشندوں کی طرح اس کے دریا بھی اپنی نظیر آپ ہیں۔ ان میں سے اکثر تو موسمی دریا ہیں اور جو غیر موسمی ہیں وہ ہم آپ سے آنکھ مچولی کھیلتے رہتے ہیں۔ پہاڑ کی چوٹیوں پر برف پگھلی تو پانی کی ایک ننھی سی دھار بہہ نکلی۔ دامنِ کوہ تک آتے آتے یہ دھار سنگریزوں کے فرش میں گم ہو گئی اور اندر ہی اندر بہنے لگی۔ کچھ دور جا کر یہ دھار دریا کی شکل میں پھر سطح پر نمودار ہو گئی اور لہرا لہرا کر بہنے لگی اور جی چاہا تو پھر روپوش ہو گئی!! بلوچستان میں ایسے زمین دوز دریا اور ندی نالے بکثرت پائے جاتے ہیں۔ کچھ دریا ایسے بھی ہیں جو عرصہ دراز تک خشک پڑے رہتے ہیں۔ آپ اور ہم یہ سمجھ لیتے ہیں کہ یہ ہمیشہ کے لئے ختم ہو گئے۔ اچانک ایک رات یہ گرجنے لگتے ہیں اور چٹانوں کو توڑتے پھوڑتے اپنی لپیٹ میں سب کچھ بہالے جاتے ہیں۔ اور پھر بڑے اطمینان کے ساتھ خشک ہو جاتے ہیں!

بلوچستان کا سب سے لمبا دریا "ہنگول" ہے۔ ہم جس سلسلۂ کوہ کو "وسطی بروہی" کہتے ہیں۔ اس کا ایک خم "ہربوئی" کہلاتا ہے۔ ہربوئی کے مغربی دامن میں وادئ شور آب ہے۔ اس نام کا دریا اسی وادی سے نکلتا ہے۔ یہ جنوب

کی سمت بہتے ہوئے آخر کار بحرِ عرب سے ہم آغوش ہو جاتا ہے۔ اس کی کل لمبائی ساڑھے تین سو میل ہے۔ ہنگول کے مشرق میں کوہ کھیرتھر کے ساتھ ہی دریائے ہَب ہے۔ اس کا سرچشمہ کوہ پب کی شمالی بلندیوں میں ہے۔ یہ پچیس میل کے بعد ذرا مغرب کی طرف مڑ کر بہتا ہوا بحرِ عرب سے جا ملتا ہے۔ بلوچستان کے علاوہ صوبۂ سندھ میں بھی یہ ایک دریا ہے جس میں سال بھر پانی چھلکتا رہتا ہے۔ سندھ میں دریائے مہران (سندھ) اور گاج کے بعد اسی دریا کا شمار ہوتا ہے۔

ہَب اور ہنگول کے درمیان بحرِ عرب میں گرنے والا تیسرا قابلِ ذکر دریا "پورالی" ہے۔ اور بعید مغرب میں دریائے دشت! یہ کچھ عجیب سی بات ہے کہ بلوچستان میں دریا بھی "دشت" کہلاتا ہے!! ان دریاؤں سے لاس بیلہ اور مکران کی وادیوں میں آب پاشی کی جاتی ہے۔

مکران کے شمال میں وسطی مکران اور سیاہان کے کوہستانی سلسلے واقع ہیں۔ ان متوازی سلسلوں کے آغوش میں جو طویل وادی ہے وہ دریائے رخشان کی جولانگاہ ہے۔ یہ دریا اپنے منبع سے نکل کر مغرب کی سمت بہتا ہوا شمال کی جانب مڑ جاتا ہے اور ایران سے آنے والے دریا ماشخیل کو ہمکنار کرتا ہوا کوہ سیاہان کے ایک عمیق شگاف میں گھس جاتا ہے۔ اور پھر اس شگاف سے نکل کر خاران کے صحرائی علاقے سے گذرتا ہوا ایک وسیع و عریض نشیب میں ختم ہو جاتا ہے جسے "ہامون ماشخیل"، یعنی ماشخیل کی جھیل کہتے ہیں۔

بلوچستان کی شمالی سرحد پر بھی ایک ایسی ہی جھیل ہے جو ہامون لورا کہلاتی ہے۔ پشین لورا دریا جو کوہ کند کی مغربی ڈھلوان سے نکلتا ہے۔ اسی میں جا کر مل جاتا ہے۔ اس کے کئی معاون ہیں۔ بار شور لورا، کاکر لورا۔ سرخاب۔ اور شورا رود۔ پشتو میں "لورا" سیلابی دریا کو کہتے ہیں اور "رود" کے معنی ایسا دریا ہے جو تمام سال رواں رہتا ہے۔ پشین لورا کی مخالف سمت یعنی مشرق میں دریائے ژوب ہے جو شمال میں دریائے گومل سے ہمکنار ہو جاتا ہے۔ ژوب کی وادی بلوچستان کی ان چند وادیوں میں سے ہے جہاں قدرت ایک فیاضانہ شان کے ساتھ ہمیشہ مسکراتی رہتی ہے۔ اس کی سب سے بڑی دلچسپی یہ ہے کہ یہ ایک قدیم تہذیب کا گہوارہ رہ چکی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ بلوچستان کا یہ حصہ موہن جو دارو سے بھی زیادہ قدیم ہے! بلوچستان کے دوسرے دریاؤں میں لورالائی بھی قابل ذکر ہے۔ اس کو انبار اور ناری بھی کہتے ہیں، لورالائی سیبی اور کچھی کے میدانوں میں اس پر بند باندھ کر یا دوسرے طریقوں سے آبپاشی کا کام لیا جاتا ہے۔

دریاؤں کے سلسلے میں آنکھ مچولی کا ذکر اوپر آچکا ہے۔ اس آنکھ مچولی سے بلوچستان کو ایک بہت بڑا فائدہ پہنچتا ہے۔ دریاؤں کے زمین دوز ہو جانے سے پہاڑوں کے دامن اور دوسرے مقامات میں زمین کے نیچے پانی کا ذخیرہ جمع ہو جاتا ہے۔ قدرت کی اس ستم ظریفی یا بلوچستان کے اس دلچسپ مذاق کو دیکھئے کہ سطح پر کھیت اور باغات تو پانی کو ترس رہے ہیں اور پانی زمین

کی تہ میں خلوت بنا بنا کر ہنس رہا ہے۔ اس کے ساتھ ہی بلوچستان کے باشندوں کی یہ ہمت بھی ملاحظہ کیجئے کہ وہ زمین کا سنگلاخ سینہ کھود کر ان تہ خانوں تک پہنچ جاتے ہیں اور اندر ایک کو دوسرے سے ملا دیتے ہیں۔ اس طرح زمین دوز نہروں کا ایک سلسلہ بن جاتا ہے جس کو "کاریز" کہتے ہیں۔ کاریزوں کی مدد سے زمین کی تہ کا آبی ذخیرہ سطح تک لے آیا جاتا ہے اور پھر اسے کھیتوں تک پہنچا دیا جاتا ہے۔ فرہاد کا جوئے شیر لانا تو ایک فسانہ ہے۔ لیکن بلوچستان کے یہ کاریز حقیقی معنوں میں جوئے شیر ہیں۔ یہ نہ ہوں تو بلوچستان کے گندمی کھیت اور انگوری باغ بھی نہ رہیں۔ کاریز کے علاوہ پانی حاصل کرنے کے لئے بلوچستان میں بیشمار چشمے اور فوارہ نما کنویں بھی ہیں لیکن کاریز کے مقابلہ میں یہ دوسرے وسائل زیادہ اہم نہیں۔

آپ اور ہم قدم قدم پر "بہار" اور "خزاں" کا لفظ استعمال کرتے ہیں۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ ہم بہار اور خزاں سے آشنا نہیں۔ جزیرہ نمائے ہند میں نہ بہار ہے نہ خزاں! ہندوستان میں صرف تین موسم ہیں، جاڑا، گرمی اور برسات، مغربی پاکستان میں تو برسات بھی نہیں۔ یہ مشرقی پاکستان کی چیز ہے۔ آپ کو بہار کی گل آفریں رعنائیاں اور خزاں کی ہوش ربا کیفیاں دیکھنی ہوں تو بلوچستان آئیے۔ مگر اتنا نہ بھولئے کہ بلوچستان تنوع اور تضاد کا دیس ہے۔ یہ تنوع اور تضاد یہاں کی آب و ہوا میں بھی کوٹ

کوٹ کر بھر دیا گیا ہے۔ بلوچستان جیسے لمبے چوڑے اور اونچے نیچے صوبے میں یکساں آب و ہوا قدرتی طور پر نہیں مل سکتی۔ جنوبی اور مغربی بلوچستان کی آب و ہوا شمالی، اور مشرق سے پیوستہ وسطی حصّوں سے بالکل مختلف ہے۔ مشرق میں سبی اور ملحقہ پست علاقوں میں آب و ہوا کی شدّت پائی جاتی ہے۔ چاغی، خاران اور وسطی مکران کا بھی یہی حال ہے۔ گرمیوں میں یہ تمام حصّے دوزخ بن جاتے ہیں۔ بلوچستان کی ایک پُرانی مثل ہے ؎

سیبی و ڈھاڈر ساختی　　　دوزخ چرا پر داختی؟

سیبی اور ڈھاڈر دوزخ ہی سہی لیکن اس کے پہلو بہ پہلو بلوچستان کے بالائی کوہستانی علاقوں کا معتدل فردوس بھی ہے۔ البتہ بلند تر حصوں میں سرمائی شدت غیر معمولی صورت اختیار کر لیتی ہے۔ ان حصّوں میں پانی تو خیر پانی ہی ہے، دوات کی سیاہی، بوتلوں میں رکھی ہوئی دوائیں اور انسانی رگوں میں دوڑتا ہوا خون تک برف بن سکتا ہے۔

آب و ہوا کے نکتہ نظر سے وسطی اور شمالی بلوچستان کے موسمی تغیر و تبدل پر ایک مجموعی نظر یوں ڈالئے۔ سال شروع ہوتا ہے تو پہاڑوں پر برف جمی ہوئی نظر آتی ہے وہ مٹیالے رنگ کے اونچے اونچے کوہسار اور ان کے بالائی کناروں پر برف کی سفید سفید تہہ کیسی بھلی لگتی ہے! اگرچہ یہ تہہ زیادہ دبیز نہیں ہوتی لیکن نیلگوں آسمان کے پس منظر میں اس کی چمک دمک سے ایک عجیب سماں پیدا ہو جاتا ہے۔ جنوری اور فروری میں اکثر برف باری ہوتی

رہتی ہے۔ مارچ شروع ہوتے ہی بلوچستان ایک انگڑائی لیتا ہے۔ موسم کے مارے، ٹھٹھرتے ہوتے، بے برگ و بار درختوں پر سُرخ سُرخ شگوفے مسکرانے لگتے ہیں۔ فضا میں کافی خنکی رہتی ہے اور کبھی کبھار ایک آدھ بادل بھی جھوم اٹھتا ہے۔ اپریل آتے آتے درختوں کی شاخوں پر سبز سبز پتّوں کا ہجوم لہرانے لگتا ہے۔ میدانوں اور چراگاہوں میں ہریالی چھا جاتی ہے۔ پہاڑوں کے دامن میں، چٹانوں کے آس پاس، کاریز اور چشموں کے کنارے خودرو پھول مسکرا اٹھتے ہیں۔ ہوائیں خنکی کی جگہ ہلکی ہلکی ٹھنڈک پیدا ہو جاتی ہے۔ تازگی، شادابی اور رنگینی کا یہ البیلا موسم جون تک دلوں کو لبھاتا رہتا ہے۔ پشتو میں اسے "سرلی" یعنی "بہار" کہتے ہیں اور واقعی بہار کا موسم ہے بھی یہی! جون کے بعد بہار ماند پڑنے لگ جاتی ہے۔ جولائی تک درجہ حرارت بلند ہو جاتا ہے، اس عرصے کو رعایتاً ہندوستان کا جیٹھ کہہ لیجیے۔ یہاں کے باشندے اسے "اہار" کہتے ہیں۔ جیٹھ کے بعد "ساون" شروع ہو جاتا ہے۔ لیکن یہ "ساون" کو پشتو کے "دسہ" کا محض لفظی ترجمہ ہی سمجھئے۔ مشرقی پاکستان کے ساون کی طرح بلوچستان کے ساون میں کالی کالی گھنگور گھٹاؤں کا شور اور برق و باراں کا زور نہیں ہوتا۔ ساون سے صرف یہی مراد ہے کہ اس کے دوران میں گرمی نہیں ہوتی۔ اور گرم گرم ریتیلی ہوائیں چلنا بند ہو جاتی ہیں۔ یہ موسم جو جون سے ستمبر کے اوائل تک رہتا ہے "دوبئی" یعنی موسم گرما کہلاتا ہے۔ مگر ہندوستان کے موسم گرما کے مقابلہ میں اسے گلابی جاڑوں کا موسم ہی کہنا مناسب ہے۔ ستمبر کے اوائل میں درختوں کی

سرسبزی مٹیالی رنگت اختیار کرلیتی ہے۔ رفتہ رفتہ درخت کے پتے
بے جان ہو کر ٹوٹنے لگتے ہیں۔ سڑکوں، میدانوں اور باغوں میں ہر درخت
کے نیچے ٹوٹے ہوئے پتوں کا پیلا پیلا ڈھیر لگ جاتا ہے۔ تین مہینے پہلے جس
جگہ باغ تھا وہاں اب ویرانی نظر آتی ہے۔ موسم کا یہ شدید ردِ عمل حد درجہ
بے کیف ہوتا ہے۔ اور یہ بے کیفی دسمبر کے اوائل تک آہستہ آہستہ شدید تر
ہو جاتی ہے۔ یہ "منیٰ" ہے یعنی موسمِ خزاں !! ـــ خزاں جب بہار کو اچھی
طرح لوٹ لیتی ہے تو کوہساروں پر سیاہی سی چھا جاتی ہے۔ اوائل دسمبر
سے وسطِ جنوری تک کا عرصہ چہلِ سیاہ کہلاتا ہے۔ وسط جنوری کے بعد
موسم ایک نئی کروٹ لے کر "چہلِ سفید" بن جاتا ہے۔ اس موسم میں
ہر طرف برف ہی برف نظر آتی ہے۔ چہلِ سیاہ اور چہلِ سفید کو ملا کر "زمیٰ"
یعنی موسم سرما کہتے ہیں۔ اور سرما کے بعد مارچ میں پھر موسم بہار آجاتا
ہے !! ـــــ پشتو کی کہاوت ہے "سرلی معمور" یعنی موسم بہار ہرا بھرا
ہوتا ہے۔ "دوبی تنور!" موسم گرما تنور کی طرح گرم ہوتا ہے۔ "منیٰ
رنړور (رنجور!) یعنی خزاں میں اضمحلال طاری رہتا ہے اور "زمیٰ حضور!"
(موسم سرما) حضورلوں کا موسم ہے۔ ان فقروں میں موسم کے تاثرات کو
مکمل طور پر پیش کر دیا گیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ بلوچستان کے موسم نے
اس کی تاریخ اور معاشرت پر بہت گہرا اثر ڈالا ہے۔ یہاں کے باشندوں
کے مزاج اور ان کی رسومات تک میں موسمی تغیرات کا اثر کارفرما نظر آتا ہے۔

قدرتی وضع وہیئت۔ دریاؤں۔ کاریزوں اور آب و ہوا کے اس پس منظر
میں بلوچستان کا ایک اور پہلو بھی دیکھتے چلئے۔ قدرت نے اس سرزمین
کے سینے پر اونچے اونچے پہاڑوں کا بوجھ لاد رکھا ہے لیکن اس کے باوجود
بلوچستان کا سینہ ہر دم دھڑکتا رہتا ہے۔ بلوچستان کی یہ دھڑکنیں "زلزلہ"
کہلاتی ہیں۔ چھوٹے چھوٹے زلزلوں کو چھوڑ کر بلوچستان میں چند ہیبت ناک
زلزلے بھی آتے ہوتے ہیں۔ ایک بار ایک ایسا ہی خوفناک زلزلہ آیا اور خواجہ
عمران اور سرکتھ کے کوہستانی دامن میں ۱۲۰ میل لمبا شگاف چھوڑ گیا۔
سنہ ۱۸۹۲ء میں ایک اور زلزلہ آیا اور ۱۹۳۵ء میں تو وہ تباہ کن جھٹکا آیا جس
کی یاد آج بھی یہاں کے باشندوں کو لرزہ براندام کر دیتی ہے۔ یہ زلزلہ نہیں
تھا ایک قیامت تھی۔ آدھی رات کو جب کوئٹہ اطمینان کی نیند سو رہا تھا
تو اچانک زمین کانپ اٹھی اور کئی سیکنڈ تک زور زور سے کانپتی رہی۔
چشم زدن میں کوئٹہ "شہر خموشاں" بن گیا! لیکن اس شہر خموشاں
میں پھر زندگی کی ہلچل پیدا ہو گئی۔ نئے طرز کے زلزلہ پروف مکانات تعمیر ہونے
لگے اور کوئٹہ کے ساتھ ساتھ سارا بلوچستان بھی ایک نئے مستقبل کی طرف
گامزن ہو گیا!

بلندی اور پستی، بگولے اور برف، تنک آب دریا اور خشک ندی نالے،
چھلکتے ہوئے کاریز اور مچلتے ہوئے چشمے، خوابیدہ کوہسار اور ہر لحظہ چونک پڑنے
والی بے قرار وادیاں ـــ یہ ہے ہمارا بلوچستان!

بلوچستان کے باشندے

بلوچستان، قدرت کے تنوع اور تضاد کا حیرت کدہ ہے۔ یہاں کی پستیاں بلندیوں کو چھوتی ہیں اور بلندیاں آسمان سے باتیں کرتی ہیں۔ یہاں چوڑے چکلے صحرا اور ریگ زار ہیں مگران کی گود میں چھوٹے چھوٹے نخلستان بھی ہیں سنگلاخ اور بے برگ و بار پہاڑوں کے سلسلے ہیں، مگران سلسلوں کی آغوش میں سرسبز وشاداب وادیاں بھی ہیں۔ اوران وادیوں میں کیا کچھ نہیں! روپہلے آبشار گندم کے سنہرے کھیت، انگور اور شہتوت کے لذت آفریں خوشے، بادام خوبانی، سیب، انار، اور شفتالو کے نکہت پاش باغ!! اور باغوں میں ریشمیں ہواؤں کے جھونکے!!۔ بلوچستان میں ایسے مقامات بھی ہیں جہاں سال بھر کم و بیش یکساں موسم رہتا ہے۔ اور ایسے بھی جہاں کا موسم ہمیشہ بدلتا رہتا ہے۔ کبھی بہار ہے، کبھی خزاں! کبھی موسم سرما ہے کبھی موسم گرما! لطف کی بات یہ ہے کہ بلوچستان کے بعض علاقوں کا موسم گرما، شمالی ہند کے موسم سرما کو شرماتا ہے۔ اور موسم سرما میں خوب برفباری ہوتی ہے۔ اسکے برخلاف

چند ایسے مقامات بھی ہیں جہاں موسم سرما میں بھی جاڑوں کو ترسنا پڑتا ہے۔

آب و گل کے اس تنوع کے ساتھ ساتھ بلوچستان کی تاریخ اور معاشرہ بھی گوناگوں رنگینیوں سے معمور ہے۔ یوں سمجھئے کہ بلوچستان کی سرزمین مغربی ایشیا کی تاریخی اور ثقافتی موجوں کا ایک قدرتی سنگم ہے۔ یا ایک ایسا مرکزی نقطہ ہے جہاں تاریخ اور ثقافت کی مختلف شاہراہیں آکر مل جاتی ہیں اور مل کر پھر مختلف سمتوں میں بٹ جاتی ہیں۔ وسط ایشیا اور مشرق وسطیٰ کے قدیم تمدنی گہواروں سے تاریخ اور تمدن، مذہب اور ثقافت، مادی حشمت اور روحانی عظمت کے جتنے لشکر بھی ایشیا کی سمت روانہ ہوئے ان میں سے اکثر و بیشتر نے بلوچستان کا رُخ کیا۔ بعض ہوا کے جھونکے کی طرح آئے اور گذر گئے، بعض اس سرزمین میں رہنے سہنے لگے اور نئے آنے والوں میں گھل مل گئے۔ ان آنے جانے والوں میں مقدونی بھی تھے، عرب بھی، غزنوی بھی تھے اور منگول بھی، مغل بھی تھے اور درانی بھی، اور انگریز تو خیر تھے ہی۔

بلوچستان کے باشندوں کے متعلق ہماری معلومات کا آغاز عرب حملہ آوروں کے وقت سے ہوتا ہے۔ اس وقت یعنی ساتویں صدی میں یہاں کے باشندے میڈ جٹ یا جاٹ، اور افغان تھے۔ میڈ، مکران کے ساحلی خطے میں رہتے تھے اور آج بھی ان کی باقی ماندہ اکثریت وہیں رہتی ہے۔ سراوان اور جھلاوان کا علاقہ جٹ باشندوں کا مسکن تھا۔ افغان، شمال سے لیکر جنوب تک پھیلے ہوئے تھے۔ اس سرزمین میں عربوں کا اقتدار کوئی تین سو برس تک قائم رہا۔ ساتویں صدی کے

بعد سے مکران میں کچھ نئے لوگ داخل ہونے لگے جو "بلوچ" کہلاتے ہیں۔ آہستہ آہستہ شمال کی جانب پھیلتے ہوئے یہ لوگ پندرھویں صدی میں کچھی تک پہنچ گئے۔ میڈ اور جٹ باشندے ان نوواردوں کے سیلاب میں بہہ گئے یا رفتہ رفتہ ان میں ضم ہو گئے۔ افغان باشندوں کا بھی یہی حشر ہوا۔ اور انہیں بلوچستان کے شمال مشرقی گوشے میں سمٹ جانا پڑا۔ چودھویں یا پندرھویں صدی میں انسانوں کا ایک نیا گروہ نمودار ہوا اور آہستہ آہستہ چند وادیوں پر چھا گیا۔ آگے چل کر اس گروہ کا نام "بروہی" پڑ گیا۔ چنانچہ اس وقت، مکران کے علاقے کو چھوڑ کر، جہاں مخلوط قسم کی آبادی ہے، بلوچستان میں آبادی کے چار بڑے بڑے گروہ ملتے ہیں۔ ایک تو وہی قدیم جٹ، دوسرا بلوچ، تیسرا بروہی اور چوتھا گروہ افغان باشندوں پر مشتمل ہے۔ آیئے، سب سے پہلے ہم جٹ باشندوں پر ایک نظر ڈال لیں۔

جٹ یا جاٹ

بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جٹ باشندے بلوچستان کے ان قدیم غیر مسلم باشندوں کی یادگار ہیں جنہوں نے عربوں کی آمد کے بعد اسلام قبول کر لیا تھا۔ مگر بعض لوگوں کا خیال ہے کہ یہ ان تاریخی اقوام میں سے ہیں جو وقتاً فوقتاً بلوچستان کو اپنی جولانگاہ بناتے رہے۔ امتدادِ زمانہ کے ساتھ داخلی اور خارجی حالات نے ان کے دیرینہ وقار اور آثار کو ملیا میٹ کر دیا اور رفتہ رفتہ یہ لوگ بلوچستان کی تاریخ اور معاشرت کی نظر سے گر گئے۔ اس کے برعکس بعض ماہرین یہ کہتے ہیں کہ جٹ ایک عام اصطلاح

ہے جس میں وہ تمام مسلمان شامل ہیں جو نہ بلوچ ہیں نہ بروہی اور نہ افغان۔ مختصراً یہ کہیے کہ جٹ باشندوں کے متعلق قطعی طور پر کچھ بھی نہیں کہا جا سکتا۔ اتنا ضرور ہے کہ ان باشندوں کی بعض رسومات وسط ایشیا کے قدیم باشندوں سے ملتی جلتی ہیں۔

ان جٹ باشندوں میں بھی دو گروہ ملتے ہیں۔ ایک گروہ کے افراد زیادہ تر ساربانی اور گلہ بانی کرتے ہیں۔ ان کو عام طور پر جت کہتے ہیں۔ دوسرا گروہ جٹ کہلاتا ہے جس کا عام مشغلہ کھیتی باڑی ہے۔ جٹ باشندوں کی اکثریت کچھی، لس بیلہ اور سبّی میں ملتی ہے۔ بلوچ اور دوسرے مستقل قبائل ان جٹ باشندوں کو خود سے کمتر سمجھتے ہیں۔ اس کا ایک معمولی ثبوت یہ ہے کہ ایک بلوچ مرد کسی جٹ عورت سے خود تو شادی کر سکتا ہے مگر کسی جٹ مرد سے اپنی بیٹی کا بیاہ نہیں کر سکتا!

بلوچ

بلوچ کون ہیں اور کہاں سے آئے ہیں؟ اس سوال کا تشفی بخش جواب آج تک کسی نے نہیں دیا۔ ہم صرف اتنا ہی کہہ سکتے ہیں کہ ۶۶۴ء میں عربوں کے پہلے حملے کے وقت بلوچ، مکران کے پہاڑی علاقوں میں رہتے تھے۔ ابن حوقل نے جو دسویں صدی میں دوسری بار ہندوستان آیا تھا لکھا ہے کہ ایران زمین میں، جو ہند اور سندھ کی سرحد پر واقع ہے، کوچ اور بلوچ رہتے ہیں۔ "ایران زمین" سے شاید مکران مراد ہے۔ اور پشتو زبان کے "کوچی" یا "کوچیؔ" کی طرح قدیم فارسی زبان میں "بلوچ" خانہ بدوش

یا جہاں گرد کو کہتے ہیں۔ اتنا تو یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ ساتویں صدی میں بلوچ قبائل کا مسکن مکران اور کرمان کا جنوبی علاقہ تھا۔ یہ بات قبیلوں کے نام پر غور کرنے سے بھی عیاں ہو جاتی ہے۔ مثلاً ایک قبیلہ بگٹی کہلاتا ہے۔ نام سے یہی پتہ چلتا ہے کہ یہ قبیلہ پہلے بگ میں آباد تھا جو بلوچستان کی مغربی سرحد کے اس پار ایران میں واقع ہے۔ اسی طرح میگسی قبیلہ مگس سے، اور بلیدی قبیلہ مکران کی وادی بلیدہ سے آیا ہے۔ مگر ساتویں صدی سے پہلے ان کا مسکن کہاں تھا اس کی بابت صرف قیاس ہی کی مدد لی جا سکتی ہے۔ خود بلوچ یہ کہتے ہیں کہ ان کا آبائی مسکن حلب یعنی ملک شام ہے۔ شام میں کچھ ایسے قبائل بھی پائے گئے ہیں جن کے نام بلوچستانی قبائل سے ملتے جلتے ہیں۔ مگر دوسری طرف بلوچوں کے متعلق کچھ ایسی معلومات بھی ملتی ہیں جن سے یہ ترکمانی نسل کے ثابت ہوتے ہیں۔ یہاں ایک نکتہ قابل غور ہے۔ اور وہ یہ کہ خانہ بدوشی اور جہاں گردی عرب اور ترک دونوں ہی کا امتیازی نشان ہے۔ اس لئے عجب نہیں کہ ہمارے بلوچ، عرب اور ترک نسلوں کے امتزاج اور انضمام کی پیداوار ہوں۔ اس قسم کا امتزاج اور انضمام ایک قدرتی عمل ہے اور مغربی ایشیا کی مخصوص جغرافی نشست اور نوعیت میں یہ عمل ہمیشہ بہت نمایاں رہا ہے۔ خود بلوچستان میں یہ چیز بہت تیزی کے ساتھ جاری ہے۔

بہرکیف! جنوبی کرمان اور مکران سے بلوچوں نے شمال اور مشرق کی طرف پھیلنا شروع کیا۔ چودھویں اور پندرھویں صدی تک یہ بلوچستان کے قلب

پر چھا گئے۔ اور سولہویں صدی میں ہر طرف یلغار کرنے لگے۔ کوہ سلیمان اور کوہ کرتھار کو عبور کر کے بعض بلوچ قبائل نے پنجاب، سندھ، اور شمالی ہندوستان کا بھی رُخ کیا۔ کہا جاتا ہے کہ بلوچوں کے رند قبیلہ کا سردار "میر چاکر" ہمایوں کے آڑے وقتوں میں بہت کام آیا اور اس طرح وہ دِلّی تک پہنچ گیا۔ اٹھارہویں، اور انیسویں صدی کی ابتدا تک بلوچوں کے مَرّی اور بگٹی قبیلوں نے کچھی کے آس پاس کے تمام کہستانی علاقوں پر قبضہ جما لیا۔ ۱۸۳۹ء جب انگریزی فوجوں نے افغانستان کا رُخ کیا تو کچھی اور بولان سے گذرتے وقت ان قبیلوں نے فوج پر حملہ کر دیا۔ پھر کیا تھا! انگریزوں اور بلوچ قبائل کے درمیان تصادم کا ایک سلسلہ شروع ہو گیا۔ بلوچوں کی مسلسل یلغار اور انگریزوں کی پیہم شکست کا یہ سلسلہ کوئی ۳۵ سال تک پوری شدت کے ساتھ جاری رہا۔ آخر کار سر روبرٹ سنڈیمن نے قبائلی سرداروں کے لئے وظیفے اور انعام و اکرام کی اسکیم چلائی۔ اور خان قلات سے گفت و شنید کر کے کوئٹہ میں "بلوچستان ایجنسی" قائم کر دی! ایجنسی کے قیام کے بعد انگریزوں نے رفتہ رفتہ تمام بلوچ قبیلوں کو اپنا صید کر لیا۔

دنیا کی اکثر قوموں کی طرح بلوچ بھی قبیلوں میں بٹے ہوئے ہیں۔ لیکن بلوچی قبیلہ کوئی متجانس گروہ نہیں ہوتا۔ بلکہ چند خارجی اجزا یا عناصر کے تدریجی انضمام سے شکل پذیر ہوتا ہے۔ قبیلے کی یہ شکل پذیری چند مخصوص زینوں سے گذرتی ہے۔ پہلا زینہ یہ ہوتا ہے کہ باہمی خانہ جنگیوں کے سلسلے میں غیر متجانس یعنی غیر متعلق افراد کسی ایک فریق کا ساتھ دیتے ہیں۔ اس کے بعد فریق کی ملک خصوصاً اراضی املاک

مثلاً کھیت وغیرہ میں حصہ لینے کی باری آتی ہے۔ اور سب سے آخر میں رشتہ داری قائم کی جاتی ہے۔ جب غیر متجانس افراد ان تینوں منازل سے گذر لیتے ہیں تو وہ اس خاص قبیلے میں جذب ہو جاتے ہیں۔ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ کسی خاص فرد یا چند افراد کو براہ راست قبیلے میں شامل کر لیا جاتا ہے۔ اس موقعہ پر چند مخصوص رسمیں ادا کی جاتی ہیں۔ پھر کچھ دنوں بعد قبیلے کی لڑکیوں سے ان کی شادی کر دی جاتی ہے۔

دوسرے قبیلوں کی طرح بلوچ قبیلے کی تعمیر بھی ایک خاص پیمانے پر ہوتی ہے۔ یعنی ایک قبیلے میں کئی فرقے ہوتے ہیں اور ہر فرقے میں کئی کئی ٹولیاں بنتی ہیں بلا اوقات ٹولیوں کے بھی کئی کئی ٹکرے ہوتے ہیں۔ ایسے چھوٹے چھوٹے ٹکروں کا سردار "معتبر" کہلاتا ہے۔ ٹکروں کو ملا کر جو ٹولی بنتی ہے اس کے سردار کو "وڈیرہ" کہتے ہیں۔ اسی طرح کئی ٹولیوں پر مشتمل جو فرقہ ہوتا ہے اس کے سردار کو "مقدم" اور سارے قبیلے کے سرغنہ کو "تمن دار" کہا جاتا ہے۔ ان قبیلوں، فرقوں، اور ٹولیوں کا سلسلہ یا نظام کچھ اتنا پیچیدہ ہوتا ہے کہ ان کا سمجھنا اور یاد رکھنا تقریباً ناممکن ہے۔ مگر ان کے قابل ذکر قبیلے مندرجہ ذیل ہیں۔

(۱) مری قبیلہ :- یہ قبیلہ بلوچستان کے شمال مشرقی شمالی علاقے میں رہتا ہے جس کو مری کہتے ہیں۔ اس قبیلے کے تین فرقے ہیں۔ غزنی، بیجرانی، اور لوہرانی! ہر فرقے کی کئی کئی ٹولیاں ہیں اور ہر ٹولی کے بے شمار ٹکڑے ہیں جن کو ان کی خاص زبان میں "پارہ" یا "فرقہ" کہتے ہیں۔

ہم "میر چاکر" کا ذکر کر چکے ہیں۔ بلوچوں کی تاریخ میں "میر چاکر" کو قومی ہیرو کا

مرتبہ حاصل ہے۔ اصل میں "چاکر" کا تعلق ایک دوسرے بلوچی قبیلے سے ہے جو "رند" کہلاتا ہے۔ اس قبیلہ کا ذکر ہم بعد میں کریں گے۔ یہاں صرف یہ بتانا مقصود ہے کہ مری قبیلہ کس طرح عالم وجود میں آیا۔ کہتے ہیں کہ جب میر چاکر نے دریائے سندھ کو عبور کر کے پنجاب کا رخ کرنا چاہا تو اس کے چند رفیقوں نے ساتھ چھوڑ دیا۔ ان لوگوں میں بجار خاں نامی ایک بلوچ تھا۔ بجار خاں کے ساتھ علی خاں، سندو خاں، وغیرہ اور ایک لوہار (آہنگر) بھی تھا۔ بیجار خاں نے بیجرانی فرقے کی بنا ڈالی۔ علی خاں نے ایک لڑکے کو گود لے لیا تھا جس کا نام غزن تھا۔ اس کے نام پر غزنی فرقہ قائم ہوا۔ لوہار پیچھے کیوں رہتا! اس نے لوہرانی فرقہ بنا لیا۔ اور یہ تینوں فرقے مل کر مری قبیلہ بن گئے۔ پھر رفتہ رفتہ اس قبیلے میں جٹ، بروہی، اور افغان وغیرہ ضم کر لئے گئے اور یہ عمل اس شدت کے ساتھ جاری رہا کہ تعداد کے اعتبار سے مری قبیلہ دوسرے تمام قبیلوں سے آگے نکل گیا!

مری علاقے کے علاوہ اس قبیلے کے کچھ لوگ ریاست قلات اور لسبیلہ میں بھی پائے جاتے ہیں۔

(۲) بگٹی قبیلہ :- علاقہ مری کے ٹھیک جنوب میں بگٹی واقع ہے۔ اس کا رقبہ چار سو مربع میل سے کچھ کم ہے۔ اس علاقے کو بگٹی اس لئے کہتے ہیں کہ قبیلے کا مسکن ہے۔ پہلے یہ قبیلہ جنوب مشرقی ایران میں بگ کے مقام پر آباد تھا۔

مری قبیلے کی طرح اس قبیلے کے بھی کئی فرقے ہیں جن کی تعداد سات ہے۔ بلوچی روایت کے مطابق اس قبیلے کا آغاز بھی مری قبیلے کی طرح ہوا۔ میر چاکر کے سات

ہم وطنوں نے اس کا ساتھ چھوڑ دیا اور اپنے نام پر مختلف فرقے قائم کر کے بگٹی قبیلے کی تشکیل کی یہاں یہ بتا دینا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ ایک عرصہ دراز تک بگٹی اور مری قبیلے ایک دوسرے کے جانی دشمن تھے اور یہ دشمنی، چشمک کی صورت میں شاید اب تک برقرار ہے۔

جسمانی ساخت کے اعتبار سے بگٹی قبیلہ بہترین بلوچ قبیلہ ہے۔ اور دلیری میں تو ان کا مقابلہ نہیں کیا جا سکتا۔ ذہنی اعتبار سے بھی شاید یہ دوسرے قبیلوں سے کچھ بہتر ہیں۔

(۳) رند قبیلہ:۔ بلوچی روایات کے مطابق ان کا جد امجد "جلال خاں" تھا۔ جلال خاں کو "جلال ہان" بھی کہتے ہیں۔ اس کے چار بیٹے تھے اور ایک بیٹی۔ بیٹوں میں سے ایک کا نام رند تھا جس کے نام پر یہ قبیلہ چل نکلا۔ "میر چاکر" کا جلال خاں یا رند سے کیا رشتہ تھا اس کی تو ہمیں خبر نہیں اور نہ اس کے کارہائے نمایاں ہی کا کچھ علم ہے مگر تمام بلوچی روایتیں میر چاکر کو اپنا قومی ہیرو سمجھتا ہیں اور تقریباً ہر بلوچ قبیلہ میر چاکر ہی سے اپنا سلسلہ ملا دیتا ہے۔

اس قبیلے کی تاریخ کے متعلق بھی ہم کچھ نہیں کہہ سکتے۔ یقین کے ساتھ صرف اتنا کہا جا سکتا ہے کہ زمانہ قدیم میں یہ قبیلہ کرمان میں رہتا تھا۔ کرمان سے نکل کر کیچ اور مکران پہنچا۔ اور یہاں سے مشرق کی سمت پھیلنے لگا۔ میر چاکر کی سرکردگی میں اس قبیلے نے دریائے سندھ کو عبور کر کے پنجاب کا رخ کیا اور جیسا کہ روایات سے پتہ چلتا ہے میر چاکر کو ہمایوں کی ہم رکابی نے دلی پہنچا دیا۔ بلوچوں کے اس "سکندر اعظم"

کو بلوچستان کے دوسرے غیر بلوچی باشندوں مثلاً براہوی اور افغان وغیرہ سے پیہم مقابلہ کرنا پڑا۔ اس نے ارغون یعنی ترکوں کا بھی مقابلہ کیا۔ لیکن اس کی داستان حیات کا یہ رزمیہ پہلو اب تک نگاہوں سے پوشیدہ ہے۔ معلوم نہیں میر چاکر کا کیا انجام ہوا مگر اتنا ضرور ہے کہ سندھ اور پنجاب کے اکثر باشندے میر چاکر کے ہم کابوں کی یادگار ہیں۔ بلوچستان میں تو جا بجا ایسے مقامات بھی ہیں جو میر چاکر سے موسوم یا منسوب کئے جاتے ہیں۔

بلوچستان میں رند قبیلے کے کئی فرقے ہیں۔ مثلاً جمالی، کھوسہ، عمرانی، چانڈی، لغاری، سنغاری وغیرہ۔ جمالی فرقے کی خاص خاص ٹولیاں طہرانی، شیر خانانی، شہالیانی شیہل زئی، واسوانی اور بابر کہلاتی ہیں۔ ان کی اکثریت سبی اور نصیر آباد میں ملتی ہے۔ کھوسہ فرقے کی تین ٹولیاں ہیں۔ روایت کے بموجب اس فرقے کا بانی "کوہ سر" نامی ایک رند بلوچ تھا یہ "کوہ سر" بگڑ کر "کھوسہ" بن گیا۔ عام خیال یہ ہے کہ میر چاکر کو دریائے سندھ عبور کرانے والے یہی لوگ تھے۔ اس مناسبت سے ان کو "میانس" بھی کہتے ہیں۔

"میانس" کا مطلب "ملاح" ہے۔ صوبہ سندھ میں بھی یہ لوگ بکثرت ملتے ہیں۔ سبی اور چند دوسرے محدود علاقوں کو چھوڑ کر بلوچستان میں رند قبیلے کو براہوی قبائل کی اتحادی فہرست میں شامل کر لیا گیا ہے۔ ایک دوسرے بلوچ قبیلہ میگسی کا بھی یہی حال ہوا۔

بلوچ قبیلوں میں ایک گروہ "گولہ" کہلاتا ہے۔ عام طور پر اس گروہ کو

بلوچوں کے بلیدی قبیلہ کا ایک فرقہ سمجھا جاتا ہے لیکن جدید تحقیقات کی رو سے "گولہ" خالص بلوچ نہیں بعض لوگوں کا قیاس ہے کہ "گولہ" اصل میں سناسی ہیں۔ بہر کیف ان کی موجودہ حیثیت ایک مستقل بلوچ فرقے کی ہے —— اب بلوچوں کو چھوڑیئے اور بروہی باشندوں پر ایک نظر ڈالیے۔

بروہی۔ بلوچ کی طرح بروہی کی اصل بھی ایک معمہ ہے۔ پرانی فارسی زبان کے مطابق اس لفظ کا مطلب "کہستانی" یا مردِ کہسار" ہے۔ لیکن اس سے ان کی اصل پر کوئی روشنی نہیں پڑتی۔ خود بروہی روایتیں یہ کہتی ہیں کہ یہ لفظ دراصل "براہو" تھا جو ان کے جدامجد کا نام ہے۔ عجب نہیں کہ لفظ "براہو" براہیم یا ابراہیم کی ایک صورت ہو۔ بلوچوں کے بعض پرانے لوک گیتوں میں ان کو "براہو" خطاب کیا گیا ہے۔ بعض ماہرین کا خیال ہے کہ بلوچوں کی طرح یہ بھی ترکمانی نسل کے ہیں۔ یہاں بروہی زبان پر بھی ایک چھچلتی نظر ڈال لیجئے۔ اس زبان کا اپنا لٹریچر کچھ بھی نہیں۔ قدرتی طور پر اس سلسلے میں ہم کو مغربی محققین پر بھروسہ کرنا پڑتا ہے۔ ان میں سے بعض یہ کہتے ہیں کہ بروہی زبان کا تعلق آریائی زبان سے ہے۔ بعض کا یہ خیال ہے کہ یہ زبان وسطی ہند کی کول زبان سے تعلق رکھتی ہے اور چند دوسرے ماہرین اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ یہ ڈراوڈین زبان کی ایک تبدیل شدہ صورت ہے۔

مستند تاریخ کے آغاز میں بروہی باشندے قلات کے آس پاس رہتے تھے۔ ان کے کئی گروہ تھے جن میں سے ایک گروہ میرواری کہلاتا تھا۔ اس گروہ کا سرغنہ "میر عمر" تمام بروہی باشندوں کا سردار تھا۔ ان بروہیوں نے رفتہ رفتہ جھلاوان

کے قدیم جٹ باشندوں کو نکال کر مستونگ سے لے کر لس بیلہ تک کے سارے علاقے پر اپنا اقتدار قائم کر لیا۔ بروہی اقتدار کی توسیع کے ساتھ لفظ "بروہی" بھی وسیع طور پر استعمال کیا جانے لگا لیکن اصل بروہی میر عمر کے خلاف ہی سمجھے جاتے ہیں۔ اس میں احمدزئی اور ان کے ہمجد، کلندرانی، قلندرنی، گرگ ناری، کمبرانی (قمبرانی!!) اور میرواری وغیرہ شامل ہیں۔

بروہیوں کا میرواری قبیلہ یا گروہ خود کو عرب اصل کا بتاتا ہے۔ ابتدا میں یہ گروہ قلات کے پاس وادی سوراب میں رہتا تھا۔ اور آہستہ آہستہ اپنا سکہ جما رہا تھا۔ سولہویں صدی میں بلوچستان کا یہ حصہ دلی کے مغل بادشاہوں کے زیر نگیں چلا گیا اور بروہیوں کو خاموش ہو جانا پڑا۔ کچھ عرصہ بعد ان کے ایک سردار میر حسن نے اس علاقے کو مغلوں سے چھین لیا۔ اس طرح سترھویں صدی تک میر حسن اور اس کی اولاد قلات پر حکومت کرتی رہی۔ لیکن پھر قلات پر میر احمد کا قبضہ ہو گیا۔ احمدزئی قبیلہ اسی میر احمد کی یادگار ہے۔

قلات کے یہ فرماں روا مکمل طور پر کبھی بھی خود مختار نہیں رہے۔ کبھی دلی اور کبھی قندھار کے آگے جھکتے رہے۔ نصیر خاں اول خان قلات کے عہد میں یعنی اٹھارھویں صدی میں افغانستان کے دربار سے "بیگلر بیگی" یعنی سرداروں کا سردار اور "والیٔ قلات" کا خطاب موصول ہوا۔ گویا اس طرح قلات کو خود مختاری عطا کی گئی۔ یہ خطاب اب بھی زیر استعمال ہے۔

بلوچستان کی تاریخ میں ان احمدزئی حکمرانوں کو خاص اہمیت حاصل ہے۔

ان میں سے نصیر خاں اوّل کو بروہی ہیرو کہا جاسکتا ہے۔ میر محراب خاں کے وقت میں پہلی جنگ افغان چھڑی اور بلوچستان کی سرزمین پر انگریزوں نے اپنا قدم رکھا۔ پھر کچھ ایسے واقعات رونما ہوئے کہ ۱۸۳۹ء میں انگریزوں نے قلات پر حملہ کردیا۔ اس حملے میں محراب خاں قتل ہو گئے۔ انگریزوں نے شاہنواز خاں کو گدی پر بٹھا دیا اور اپنا ایک "پولیٹیکل افسر" ساتھ لگادیا۔ لیکن ایک ہی سال بعد دوسرے بروہی قبیلوں نے بغاوت کردی۔ اور شاہنواز خاں کو میر نصیر خاں ثانی کیلئے جگہ خالی کرنی پڑی۔ انگریزوں نے ۱۸۵۴ء میں قلات سے پہلا معاہدہ کیا۔ نصیر خاں ثانی تو چل بسے لیکن گذشتہ واقعات نے بروہی سرداروں کو قلات کی طرف سے بیزار کردیا تھا۔ قدرتی طور پر ہر طرف بغاوت، سازش، اور فتنوں نے سر اٹھایا۔ عین اس موقع پر میجر روبرٹ سینڈیمن، جو بعد میں "سر" کہلائے، پردے پر نمودار ہوتے۔ آپ نے خان قلات سے دو مرتبہ گفت وشنید کی۔ اس کے دو نتیجے برآمد ہوتے۔ ایک تو یہ کہ خان قلات اور دوسرے بروہی سرداروں کے درمیان ایک دوستانہ معاہدہ تشکیل پایا جس کو "معاہدۂ مستونگ" کہتے ہیں۔ دوسرا نتیجہ یہ برآمد ہوا کہ خود انگریزوں اور خان قلات کے درمیان ایک معاہدہ ہو گیا جس کی رو سے سبی، بولان، اور کوئٹہ پشین کا تمام علاقہ تیس ہزار روپے سالانہ کے عوض انگریزوں کے دست تصرف میں دے دیا گیا! اس یادگار معاہدے کی تاریخ ۸ رجون ۱۸۸۳ء ہے۔

ان تاریخی جھلکیوں کو یہیں چھوڑیئے اور اصل موضوع کی طرف آیئے۔ نصیر خاں

اوّل نے سراوان اور جھلاوان کے منتشر قبیلوں کو ایک وفاقی نظام میں پرو دیا۔ "بروہی" اسی قبائلی وفاق یا اتحاد کے لئے استعمال کیا جاتا ہے۔ ان قبیلوں کے دو بڑے بڑے گروہ ہیں۔ ایک گروہ کا مسکن قلات کا شمالی علاقہ ہے جس کو سراوان کہتے ہیں۔ اس گروہ کے خاص خاص قبیلے رئیسانی، شاہوانی، محمد شاہی، بنگل زئی اور لہڑی وغیرہ ہیں۔ ان کا سرغنہ رئیسانی سردار ہوتا ہے۔ دوسرا گروہ قلات کے جنوبی علاقے میں رہتا ہے جس کو جھلاوان کہتے ہیں۔ اس گروہ میں بھی کئی قبیلے ہیں مثلاً ظہری، منگل، میرواری، محمد حسنی وغیرہ۔ ان کا سربرآوردہ ظہری سردار ہوتا ہے۔ اور ان دونوں گروہ کی پیشوائی "خانِ معظم بگلر بیگی والیٔ قلات" کرتے ہیں۔

بلوچستان کے دوسرے قبیلوں کی طرح بروہی قبیلے بھی فرقوں اور ٹولیوں میں بٹے ہوتے ہیں۔ ہر فرقہ اور ہر ٹولی کا اپنا اپنا لیڈر ہوتا ہے۔ بلوچوں کی طرح بروہی قبیلوں کی تشکیل میں بھی قرابت سے زیادہ جنگی رفاقت کا عنصر کام کرتا ہے۔

بلوچ کے مقابلے میں بروہی زیادہ سورما نہیں ہوتے لیکن ان میں بعض امتیازی خوبیاں بھی ہیں۔

بلوچوں کی طرح بروہی بھی بڑے مہمان نواز ہوتے ہیں۔ ان کا دیرینہ مشغلہ گلہ بانی کے ساتھ خانہ بدوشی بھی ہے مگر رفتہ رفتہ یہ دوسرے مشغلوں کو بھی اختیار کر رہے ہیں۔

افغان بلوچ اور بروہی باشندوں کے علاوہ بلوچستان میں

افغان بھی رہتے ہیں اور ان کی تعداد کچھ کم بھی نہیں۔ تاریخی اعتبار سے افغانوں کا اصل وطن کوہِ سلیمان خصوصاً تخت سلیمان کا مغربی دامن ہے۔ یہ علاقہ بلوچستان کی شمال مشرقی سرحد پر واقع ہے۔ ساتویں صدی کے اوائل میں یہ افغان بلوچستان کی ژوب وادی میں پھیلے ہوئے تھے اور اس کو اپنا اڈہ بنا کر ہر طرف پھیل رہے تھے۔ گیارہویں صدی کی ابتدا تک وہ ملتان پہنچ گئے۔ ان کے دو قبیلوں۔ لودھی اور سوری ۔ نے دلی کے تاجدار بھی پیدا کئے۔ اٹھارہویں صدی میں نادر شاہ اور احمد شاہ دونوں نے وادیٔ ژوب کو اپنا نشانہ بنایا۔ احمد شاہ نے ژوب اور آس پاس کی چند دوسری وادیوں کو افغانوں کے جوگی زئی خاندان کو بخش دیا۔

پہلی جنگ افغان کے وقت انگریزوں کو وادیٔ ژوب کے ان افغان باشندوں کا سامنا کرنا پڑا۔ ان میں سے ایک شخص شاہجہاں تھا جو انگریزوں کا سخت دشمن تھا۔ چنانچہ انگریزوں کو اس سے اکثر مقابلہ کرنا پڑا۔ اور بار ہا شکست کھانی پڑی۔ جنگِ افغان کے بعد بلوچستان کا ایک پرانا ضلع تھل انگریزوں کے قبضے میں آگیا مگر شاہجہاں اور اس کے مٹھی بھر ساتھیوں نے انگریزوں کو یہاں بھی آرام کی نیند سونے نہ دیا۔ آخرکار انگریزوں نے پورے طور پر مسلح ہو کر وادیٔ ژوب پر چڑھائی کر دی۔ یہ ۱۸۸۴ء کی بات ہے۔ ۱۸۹۰ء میں یعنی چھ سال بعد انگریزوں نے ژوب میں اپنی پولیٹیکل ایجنسی قائم کر لی!

افغان ماہر نسبیات کا کہنا ہے کہ ان کا سلسلۂ نسب ملک طالوت سے

ملتا ہے۔ کہتے ہیں کہ ملک طالوت کا گھر کوہ سلیمان کے ٹھیک مغرب میں تھا۔ بلوچستان کے اس علاقے کو کاکر خراسان کہا جاتا ہے۔ ملک طالوت کی ۳۷ ویں پشت میں ایک شخص قیس عبدالرشید تھا۔ اس کے تین بیٹے تھے۔ گرگشت، سرابن، اور بیطان! یہی تینوں تمام افغان قبائل کے جدامجد کہلاتے ہیں۔

گرگشت کے تین بیٹے تھے۔ پہلا سنڈو جس نے سنڈو خیل قبیلہ قائم کیا۔ دوسرا بابی۔ اس قبیلے کے کچھ افراد کوئٹہ پشین اور قلات میں ملتے ہیں۔ تیسرا بیٹا داآئی کہلاتا ہے۔ اگرچہ خود اس کے نام پر کوئی قبیلہ نہیں لیکن اس کی نسل سے دو قابل ذکر قبیلے نکلے۔ ایک تو کاکر اور دوسرا پنی قبیلہ جس کو پنری بھی کہتے ہیں۔ کاکر قبیلے کے تین فرقے پائے جاتے ہیں۔ حسب دستور ہر فرقے کی کئی کئی ٹولیاں ہیں۔ کاکر افغانوں کی کثیر تعداد ژوب، کوئٹہ پشین، اور لورالائی کے اضلاع میں پائی جاتی ہے۔ پنی قبیلے میں وادیٔ ژوب کے موسیٰ خیل اور سیبی کے پنی شامل ہیں۔

قیس عبدالرشید کے دوسرے بیٹے سرابن کی اولاد میں سے کچھ "زمند" کہلاتے ہیں جو پشین کے آس پاس رہتے ہیں۔ کچھ کاسی کے نام سے مشہور ہیں۔ ان میں سے یوسف زئی بھی ہیں۔ ان کے علاوہ اس گروہ میں ترین، شیرانی، بریچ، اور چند دوسرے قبیلے بھی شامل ہیں۔ تعداد کے اعتبار سے ترین قبیلہ سب سے زیادہ اہم ہے۔ یہ قبیلہ لورالائی، سیبی اور کوئٹہ پشین میں چھایا ہوا ہے۔

بیطان کی اولاد میں سے بلوچستان کے مستقل باشندے بہت ہی کم تعداد میں ہیں۔ ان میں سے غلزئی خانہ بدوش بلوچستان کے "عارضی باشندے" کہے

جاسکتے ہیں۔ ایسے خانہ بدوش افغان قبیلے بلوچستان کی سرحد کے اس پار شمال میں رہتے ہیں۔ موسم سرما میں یہ قبیلے اپنے اپنے مسکن سے نکل جاتے ہیں اور دوسری وادیوں میں پناہ لیتے ہیں۔ چنانچہ اس سالانہ نقل وطن میں کچھ وادیٔ ژوب کو اپنی عارضی سکونت گاہ بنا لیتے ہیں۔

بلوچی اور براہوی قبیلوں کی طرح افغان قبیلہ بھی فرقوں اور ٹولیوں پر مشتمل ہوتا ہے۔ مگر ایک بنیادی فرق یہ ہے کہ افغان قبیلہ "یک جدی" اصول پر تشکیل پاتا ہے۔ بلوچی اور براہوی قبیلوں کے سلسلے میں ہم یہ عرض کر چکے ہیں کہ ان کے یہاں قبیلے کی تشکیل میں خارجی عناصر کو جذب کر لینے کا عمل زیادہ نمایاں رہتا ہے۔ اگرچہ افغان قبیلوں میں بعض "ہمسائے" بھی ملتے ہیں۔ "ہمسایہ" سے کوئی ایسا قبیلہ مراد ہے جو قربت مکانی کی بدولت معاشی، اجتماعی اور دوسرے میل جول کا مستحق بن جاتا ہے۔ مگر یہ ہمسائے افغان قبیلوں کے اجزائے ترکیبی نہیں بنتے —— ہمسایہ بہر حال ہمسایہ ہی ہوتا ہے۔ "یک سایہ" تو نہیں ہوتا!!

ایک دوسرا بنیادی فرق یہ ہے کہ ہر بلوچ قبیلے کا ایک مسلّمہ سردار ہوتا ہے اور قبیلے کے دوسرے سربرآوردہ یعنی "مقدم"، "وڈیرہ" وغیرہ اس سردار کے ماتحت ہوتے ہیں۔ لیکن افغان قبیلے میں یہ حسن تنظیم مفقود ہوتا ہے۔ افغان قبیلے میں یہ ہوتا ہے کہ ہر فرقے اور ہر ٹولی سے ایک ایک فرد جو سبھوں سے زیادہ ممتاز نظر آتا ہے، منتخب کر لیا جاتا ہے۔ بلوچوں کے یہاں قبیلے کی سرداری عموماً موروثی اصول پر چلتی ہے مگر افغانوں میں ایسا نہیں ہوتا۔

افغانوں کے ڈیل ڈول اور چہرے مہرے سے شاید ہی کوئی شخص ناواقف ہو۔ یہ لوگ بڑے قد آور، چوڑے چکلے، اور تیکھے نقشے والے ہوتے ہیں۔ ان کے چہرے کی سرخ رنگت، اور گھنے گھنے ابرو سے درشتی ٹپکتی ہے۔ دیکھنے میں بے حد استوار معلوم ہوتے ہیں۔ شجاعت میں بلوچ افغانوں سے کم نہیں ہوتا مگر نسبتاً صلح پسند ہوتا ہے۔ غیر مشروط مہمان نوازی ہر بلوچ کے لئے ایک مقدس فریضہ ہے۔

ان باشندوں کے علاوہ بلوچستان میں کچھ ایسے باشندے بھی ہیں جو مندرجہ بالا کسی صف میں نہیں آتے۔ یا جن کی منفرد حیثیت صرف ثانوی درجہ رکھتی ہے۔ اس قسم کے باشندوں میں بلوچستان کے سیّد خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ان کا کوئی قبائلی نظام نہیں ہوتا۔ بلکہ یہ منتشر گروہ میں رہتے ہیں مثلاً حسینی سید، بخاری سید، بدار، مودودی، قریشی وغیرہ۔ جسمانی مماثلت اور عادات و اطوار کی ہم رنگی کے سبب ان میں سے اکثر افغان معلوم ہوتے ہیں۔ مگر یہ افغان نہیں ہوتے۔

بلوچستان قدیم کی ایک جھلک

بلوچستان کی تاریخ کا مطالعہ کرتے وقت کچھ یوں محسوس ہوتا ہے جیسے ہم ایک چھوٹے سے پُرسکون جزیرہ میں کھڑے ہیں، ہمارے چاروں طرف دور دور تک سمندر کی اُبھرتی ڈوبتی موجوں کا شور برپا ہے، یہ اُبھرتی ڈوبتی موجیں ہر طرف سے دوڑتی ہوئی ہمارے جزیرہ تک پہنچ رہی ہیں لیکن جزیرہ تک آتے آتے ان کا سارا زور ختم ہو جاتا ہے اور جب کبھی کبھار سرکش موجیں جزیرہ کو روندتی، اِدھر سے اُدھر نکل جاتی ہیں تو اس کا دیرینہ سکون بھی ایک ہلچل میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ مگر یہ ہلچل فوراً ہی ختم ہو جاتی ہے۔ جزیرہ پر پھر وہی سکون، وہی سکوت چھا جاتا ہے!

تاریخ کے متلاطم سمندر کے بیچوں بیچ بلوچستان کا یہ "جزیرہ" مغربی پاکستان کی قدرتی ہیئت کا ایک دلفریب پہلو ہے۔ اس سطح مرتفع پر جو ایک

ہزار سے لے کر تین ہزار فٹ تک بلند ہے کھڑے ہو کر دیکھیے تو شمال کی نظر افغانستان سے گذرتی ہوئی ترکستان تک پہنچ جائے گی۔ یہ وہی خطہ ہے جو غالباً قوم آریہ کا ابتدائی مسکن تھا۔ آریہ، ساکا، کوشان، تاتار، منگول وغیرہ اسی خطہ سے نکل نکل کر ایران و ہندوستان میں داخل ہوتے تھے۔ بخارا، سمرقند، مرو، اور بلخ اور جیحون و سیحون کے دریا آج تک ان کی عظمت رفتہ کی داستان سناتے ہیں۔ اس سے کچھ ادھر عین بلوچستان کی شمالی سرحد پر کابل، غزنی، اور قندہار کا علاقہ ایک دوسرا عرصہ محشر بنا رہا ہے۔ یوں کہنے کو تو یہ ایک کہستانی خطہ ہے بہت بلند اور دشوار گذار، لیکن مختلف اقوام کے فاتح لشکروں کی پیہم آمد و رفت نے اس کو اتنی بار روندا ہے کہ یہ دشوار گذار بلندیاں بھی ہموار پستیاں بن گئی ہیں۔ مغرب کی سمت نظر اٹھایئے تو خاران اور مکران کو عبور کرتے، ایران سے گذرتے ہوتے، آپ آرمینیا پہنچ جائیں گے۔ دو ڈھائی ہزار سال قبل مسیح آرمینیا میں یراد تہ یا ارارت نام کی ایک سلطنت تھی۔ اس کے مشرق میں سرزمین عراق کی قدیم سلطنتوں یعنی سمیری، اکاد، بابل اور آشور کی ہم عصر اور حریف، عیلامی سلطنت تھی۔ آلِ عیلام فنا ہو گئے تو ان کی جگہ میڈیا کو عروج نصیب ہوا۔ پھر یکے بعد دیگرے بلوچستان کے اس مغربی کنارے ہخامنشی، یونانی، اشکانی، اور ساسانی پرچم لہرائے۔ آخر کار اس سرزمین پر اسلام کا آفتاب طلوع ہوا جو کتنے ہی بادلوں سے گذرنے کے باوجود آج بھی جوں کا توں جگمگا رہا ہے۔
اب جنوب میں بحرِ عرب کی طرف سے نظریں اٹھا کر مشرق کی طرف دیکھیں

بلوچستان قدیم کی ایک جھلک

بلوچستان کی تاریخ کا مطالعہ کرتے وقت کچھ یوں محسوس ہوتا ہے جیسے ہم ایک چھوٹے سے پُرسکون جزیرہ میں کھڑے ہیں، ہمارے چاروں طرف دور دور تک سمندر کی اُبھرتی ڈوبتی موجوں کا شور برپا ہے، یہ اُبھرتی ڈوبتی موجیں ہر طرف سے دوڑتی ہوئی ہمارے جزیرہ تک پہنچ رہی ہیں لیکن جزیرہ تک آتے آتے ان کا سارا زور ختم ہو جاتا ہے اور جب کبھی کبھار سرکش موجیں جزیرہ کو روندتی، اِدھر سے اُدھر نکل جاتی ہیں تو اس کا دیرینہ سکون بھی ایک ہلچل میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ مگر یہ ہلچل فوراً ہی ختم ہو جاتی ہے۔ جزیرہ پر پھر وہی سکون، وہی سکوت چھا جاتا ہے!

تاریخ کے متلاطم سمندر کے بیچوں بیچ بلوچستان کا یہ "جزیرہ" مغربی پاکستان کی قدرتی ہیئت کا ایک دلفریب پہلو ہے۔ اس سطح مرتفع پر، جو ایک

ہزار سے لے کر تین ہزار فٹ تک بلند ہے کھڑے ہو کر دیکھئے تو شمال کی نظر افغانستان سے گذرتی ہوئی ترکستان تک پہنچ جائے گی۔ یہ وہی خطہ ہے جو غالباً قوم آریہ کا ابتدائی مسکن تھا۔ آریہ، ساکا، کوشان، تاتار، منگول وغیرہ اسی خطہ سے نکل کر ایران و ہندوستان میں داخل ہوتے تھے۔ بخارا، سمرقند، مرو، اور بلخ اور جیحون و سیحون کے دریا آج تک ان کی عظمت رفتہ کی داستان سناتے ہیں۔ اس سے کچھ ادھر عین بلوچستان کی شمالی سرحد پر کابل، غزنی، اور قندھار کا علاقہ ایک دوسرا عرصہ محشر بنا رہا ہے۔ یوں کہنے کو تو یہ ایک کہستانی خطہ ہے بہت بلند اور دشوار گذار، لیکن مختلف اقوام کے فاتح لشکروں کی پیہم آمد و رفت نے اس کو اتنی بار روندا ہے کہ یہ دشوار گذار بلندیاں بھی ہموار پستیاں بن گئی ہیں۔ مغرب کی سمت نظر اٹھایئے تو خاران اور مکران کو عبور کرتے، ایران سے گذرتے ہوتے، آپ آرمینیا پہنچ جائیں گے۔ دو ڈھائی ہزار سال قبل مسیح آرمینیا میں یراوتہ یا ارارت نام کی ایک سلطنت تھی۔ اس کے مشرق میں سرزمین عراق کی قدیم سلطنتوں یعنی سمیری، اکاد، بابل اور آشور کی ہم عصر اور حریف، عیلامی سلطنت تھی۔ آلِ عیلام فنا ہو گئے تو ان کی جگہ میڈیا کو عروج نصیب ہوا۔ پھر یکے بعد دیگرے بلوچستان کے اس مغربی کنارے ہخامنشی، یونانی، اشکانی، اور ساسانی پرچم لہرائے۔ آخر کار اس سرزمین پر اسلام کا آفتاب طلوع ہوا جو کتنے ہی بادلوں سے گذرنے کے باوجود آج بھی جوں کا توں جگمگا رہا ہے۔

اب جنوب میں بحرِ عرب کی طرف سے نظریں اٹھا کر مشرق کی طرف دیکھیں

توسندھ اور پنجاب کے سنہرے میدانوں کے چہروں پر تاریخ کی نقاب کچھ اس طرح جھلملائے گی کہ آپ اور ہم اس کی تجلیوں کا صحیح اندازہ بھی نہیں لگا سکیں گے!

یہ ہے بلوچستان کا گرد و پیش جس کے پس منظر میں اس کی مرکزی اہمیت خود بخود آشکارا ہو جاتی ہے۔ "مرکزیت" سے مراد یہ نہیں کہ بلوچستان کوئی تاریخی چوراہہ ہے، جدھر سے جس کا جی چاہے چلا آئے، دوسروں سے ٹکرائے، قیامت برپا کرے اور اس پر اپنا قبضہ جمائے۔ بلوچستان کی مرکزیت میں بھی ایک انفرادیت پائی جاتی ہے اور یہی انفرادیت تاریخ کے ہر دور میں اس کی ممتاز خصوصیت رہی ہے۔ اس امر کو ذہن نشین کرنے کے لئے افغانستان یا بھارت کے گنگا جمنی میدان کو لیجئے۔ افغانستان اور بھارت کے اس خطے کی کوئی تاریخی انفرادیت، کوئی علیحدہ مزاج اور لب و لہجہ نہیں۔ خالص تاریخی اعتبار سے یہ دونوں صرف آئینے ہیں جو تاریخ کے اتار چڑھاؤ کی عکاسی کرتے ہیں اور بس آئینے صرف عکاسی ہی کر سکتے ہیں ان کی سطح سے جاندار تخلیقی نقوش نہیں ابھر سکتے۔ اس کے برعکس بلوچستان کا ایک اپنا نقش ہے، اس کے باشندوں کا ایک مخصوص تاریخی مزاج ہے، ان کی ایک علیحدہ آواز اور امتیازی روایت بھی ہے۔ اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ بلوچستان پر بھی آس پاس کے علاقوں نے اپنا عکس ڈالا ہے مگر اس کی نوعیت بالکل ایسی ہے جیسے کسی دشت نورد کے چہرہ پر گرد کی تہہ! ایسا کیوں ہے؟— تاریخ کے طوفانی گردابوں میں گھرے رہنے کے باوجود بلوچستان ایک پرسکون جزیرہ کی طرح کیونکہ قائم رہا ہے؟ اس کا جواب ہم مختصراً یوں دے سکتے ہیں

کہ بلوچستان کی انفرادیت اس کی قدرتی تعمیر و تشکیل کا نتیجہ ہے، ہزاروں فٹ اونچے پہاڑوں کا چوطرفہ حصار، ان کے عمیق، تنگ، پیچدار اور پرخطر درّے، چھوٹی بڑی وادیاں اور دو وادیوں کے درمیان سنگلاخ چٹانوں کی پھر ویسی ہی اونچی اونچی دیواریں، پتھریلے میدان اور جھلسے ہوئے صحرا، بے آب دریا اور گمنام چشمے، وہ چند قدرتی عناصر ہیں، جنہوں نے بلوچستان کو بیرونی حملہ آوروں کے بے روک استحصال سے بڑی حد تک محفوظ کر کے اس کے باشندوں کو ایک پرامن گہوارۂ حیات عطا کیا ہے۔ سیاسی اعتبار سے بلوچستان پر کبھی ایران کا سایہ پڑا کبھی سندھ کا لیکن یہ سائے گذرتے ہوئے بادلوں کے سائے تھے۔ آئے اور چلے گئے۔ ان وادیوں اور صحراؤں پر ان کا اثر تک نہیں ہوا اگر ہوا بھی تو بادلوں کے ساتھ رخصت ہو گیا اور پھر وہی نتھری چٹان، وہی سجل ریت، وہی نرم زمین اور نیلا آسمان نظر آنے لگا۔

بلوچستانِ قدیم کی غیر نوشتہ تاریخ چار ہزار سال قبل مسیح سے شروع ہوتی ہے۔ جب یہاں آج کی بہ نسبت زیادہ بارش ہوتی تھی اور یہ علاقہ بھی ایک "کشمیر" تھا۔ اس عہد کہن کے تاریخی نقوش مدفون اور نیم مدفون کھنڈرات کی صورت میں کہیں کہیں اب بھی باقی ہیں۔ ایسے کھنڈروں کا ایک سلسلہ بلوچستان کے شمال مشرقی گوشہ سے لے کر جنوب مغربی سرحد تک پھیلا ہوا ہے۔ اس کے تقابلی مطالعہ کے بعد ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ ژوب اور اس کی قریبی وادیاں بلوچستان کی تاریخ کی سب سے پرانی خلوتیں ہیں۔ ژوب کے ایک مقام

رانہ غنڈئی میں آثار کی پانچ تہیں کھودی گئی ہیں۔ سب سے نچلی تہہ سے جو چیزیں دستیاب ہوتی ہیں۔ ان کو دیکھ کر گمان ہوتا ہے کہ یہ جگہ خانہ بدوش قبائل کے پڑاؤ یا قیام گاہ کا کام دیتی تھی۔ کچھ عرصہ بعد یہاں کچھ نئے لوگ آئے اور مستقل طور پر یہیں بس گئے۔ ان کے بود و ماند کے آثار نچلی تہہ کے اوپر یعنی دوسری تہہ سے ملتے ہیں۔ اسی زمانہ اور اسی نوعیت کے نشانات وادی ژوب میں بھی دوسرے مقامات سے دستیاب ہوتے ہیں۔ رانہ غنڈئی کے یہ نو وارد کون تھے۔ اور کہاں سے آئے تھے۔ اس کا قطعی جواب کوئی بھی نہیں دے سکتا اتنا ضرور ہے کہ یہ لوگ مدنی زندگی بسر کرتے تھے یعنی بستیاں بنا کر گھروں میں رہنے سہنے لگے تھے۔ شاید گلّہ بانی کے ساتھ تھوڑی بہت کھیتی باڑی بھی کر لیتے تھے اور چاک پر کچّی مٹّی کے برتن بناتے تھے جو "پھیکی رنگینی" اور "سادہ نقش کاری" کے حامل ہوتے تھے۔ ماہرین آثار قدیمہ کا خیال ہے کہ رانہ غنڈئی کا یہ دوسرا دور عہد ہڑپہ سے بھی زیادہ قدیم ہے۔ کیونکہ اس کا زمانہ چار ہزار قبل مسیح معلوم ہوتا ہے۔ اس کے بعد رانہ غنڈئی کے تیسرے دور کی تین ثانوی تہیں ملتی ہیں جن سے ۳ ہزار قبل مسیح سے لے کر ۲ ہزار قبل مسیح یعنی ایک ہزار سال کی مدنی زندگی کا ارتقائی عکس جھلکتا ہے اس دور کی آخری صدیوں کے آثار فورٹ سینڈمن کے پاس سے بھی دستیاب ہوتے ہیں۔ لورالائی کے کھنڈر بھی ژوب کے دوسرے اور تیسرے دور کے زمانہ ہی کے ہیں۔ اس تیسرے دور سے ژوب اور آس پاس کی وادیوں میں ہڑپہ کی تہذیب کے اثرات بکثرت نظر آنے لگتے ہیں۔ گویا ایک ڈیڑھ ہزار سال تک الگ تھلگ رہنے کے بعد بلوچستان کا یہ حصہ اپنے مشرقی ہمسائے

سے واضح تعلقات پیدا کر لیتا ہے مگر تیسرے دور کے اختتام پر ارتقا کا یہ خاموش سلسلہ اچانک ٹوٹ جاتا ہے اور تباہی بربادی، لوٹ مار کے نشانات اُبھر آتے ہیں۔

اب ذرا وادی ژوب کے جنوب مغرب پر نظر ڈالئے، کوئٹہ اور درہ بولان سے لے کر ریاست قلات کے صوبہ جھالاوان میں نال سے ہوتے ہوئے ننداره، کولوا اور دریائے کیچ کور (مکران) کے سرچشمہ تک کھنڈروں کا ایک طویل سلسلہ ملتا ہے جو مجموعی طور پر ژوب کے تیسرے دور کا ہمعصر ہے۔ یعنی یہ ۳ ہزار اور ۲ ہزار قبل مسیح کے درمیانی عہد سے تعلق رکھتا ہے۔ اسی دور کے آثار لس بیلہ سے بھی دریافت ہوتے ہیں۔ جنوب مغربی گوشہ میں یعنی کولوا کے گرد و نواح سے لے کر دریائے دشت تک کچھ ایسے آثار بھی پائے جاتے ہیں جو مندرجہ بالا گروہ سے معمولی فرق رکھتے ہیں اور نسبتاً جدید ہیں۔ وسطی اور جنوب مغربی بلوچستان کے ان آثار میں جزوی اختلافات کا سب سے نمایاں ثبوت ان ٹھیکروں کے مختلف اسالیب میں ملتا ہے جو ان مقامات سے دستیاب ہوتے ہیں۔ ایک دوسرا فرق یہ نظر آتا ہے کہ وسطی بلوچستان میں مقامی رنگ بہت نمایاں ہے لیکن جنوب مغربی بلوچستان میں مقامی رنگ پر ہڑپہ کا تہذیبی رنگ غالب ہے۔

تاریخ کے اس دور میں اہل بلوچستان کی عام زندگی کی ٹھیک ٹھیک تصویر تو پیش نہیں کی جا سکتی۔ لیکن ایک ادھورا تصور ضرور مرتب کیا جا سکتا ہے۔ اس دور میں وسطی بلوچستان کے باشندے اپنی اپنی وادیوں میں چھوٹے چھوٹے گاؤں بسا کر رہتے تھے۔ یہ لوگ پتھر کی چوکور سلوں کو گارے میں دبا دبا کر مکان بنا لیتے تھے۔

ہر مکان ایک دو کمروں پر مشتمل ہوتا تھا۔ مکانوں کی دو طرف قطاروں کے درمیان چھ سات فٹ چوڑی "سڑک" چھوڑی جاتی تھی۔ لوگوں کا عام پیشہ کھیتی باڑی تھا۔ ضرورت کے لئے تانبے کی کلہاڑی اور دوسرے آلات بھی تیار کر لئے جاتے تھے اس کے لئے خام تانبا انہیں خود بلوچی پہاڑوں سے مل جاتا تھا۔ اعلیٰ قسم کے گلی ظروف کے علاوہ مختلف قسم کے پتھروں کے گول اور نکیلے ٹکڑوں کے منکے اور چینی کی چیزیں خصوصاً زیورات، ان کی اہم صنعتیں تھیں۔ ان کی چھوٹی چھوٹی منتشر بستیوں میں نہ تو کوئی محل ہوتا تھا نہ معبد۔ جب کوئی مر جاتا تھا تو یہ لوگ اس کو مٹی کے ظروف، کلہاڑی، بھیڑ بکریوں کی ہڈیوں اور "جواہرات و زیورات" کے ساتھ زمین میں گاڑ دیتے تھے۔ یہ چیزیں مرنے والے کا "اثاثہ لحد" ہوتی تھیں۔ شمال مشرقی بلوچستان یعنی وادی ژوب اور وسطی بلوچستان کے باشندوں کی تہذیب کا یہ فرق قابل ذکر ہے کہ اول الذکر علاقہ میں مردوں کو عام طور پر جلا دیا جاتا تھا۔

جنوب مغربی بلوچستان کے وہ آثار قدیمہ جن پر ہڑپہ کلچر کی چھاپ پائی جاتی ہے "کلی کلچر" سے موسوم کئے جاتے ہیں اس کلچر کی سب سے اہم یادگار پکائی ہوئی مٹی کے وہ چھوٹے چھوٹے مجسمے ہیں جو تقریباً ہر مقام سے برآمد ہوئے ہیں۔ ان میں اکثر تو گائے بیل کے مجسمے ہیں لیکن زیادہ تعداد مورتیوں کی ہے ان کے مصرف یا استعمال کے متعلق تو کچھ بھی نہیں کہا جا سکتا۔ لیکن ایک ہی قسم کی ان "تصویروں" کو تھوڑی دیر تک غور سے دیکھتے رہیئے تو ایسا معلوم ہوگا جیسے گہرے سانولے یا کالے رنگ، بھرے بھرے ہونٹوں، دوشیزہ سینوں والی ایک

"جیتی جاگتی" عورت پتلی کمر پر ہاتھ رکھے آپ کے سامنے کھڑی ہے۔ کلائیوں پر چوڑیاں اور بازوؤں پر "بازوبند" یا "جوشن" پہنے ہوئے ہے۔ گلے میں کئی کئی لڑیوں کا ہار پڑا ہوا ہے اور بالوں کو یوں آراستہ کر رکھا ہے کہ سامنے کی طرف ایک بل کھائی ہوئی اونچی لہر بن گئی ہے۔ باقی کو ایک چوڑی تہہ کی صورت میں گردن پر چھوڑ دیا ہے۔ غور کیجئے۔ آج سے کوئی ساڑھے چار ہزار سال پہلے کی یہ "مکرانی خاتون" کتنی "فیشن ایبل" نظر آتی ہے!

اس عہد کے تاریخی عالمی پس منظر کو سامنے لایئے تو اس خاتون کی آرائش و زیبائش جس تہذیبی ارتقا کی غمازی کر رہی ہے اس کا سبب سمجھ میں آنے لگتا ہے۔ اس کے مغرب میں عیلامی، سمیری، اور مشرق میں اہل ہڑپہ و موئن جو دڑو کا آفتاب اقبال نصف النہار پر پہنچا ہوا تھا۔ ان آفتابوں کی لمبی لمبی روپہلی سنہری شعاعیں جنوب مغربی بلوچستان پر یوں پڑ رہی تھیں کہ خود یہ ایک چھوٹا سا آفتاب معلوم ہوتا تھا مشرق سے وادی سندھ کے تاجروں کے قافلے خشکی کی راہ سے جنوب مغربی بلوچستان آ کر اپنا سامان فروخت کرتے تھے۔ مکرانی تاجر اس سامان کے ساتھ کچھ اپنا مخصوص سامان تجارت لے کر خلیج فارس کو کشتیوں سے عبور کر کے سمیریا تک پہنچتے تھے۔ یہاں سے خرید و فروخت کر کے دیالہ کا رخ کرتے تھے جو بغداد کے پاس واقع تھا۔ دیالے سے وہ مری چلے جاتے جو شام کی سرحد پر تھا اور پھر اسی راہ سے مکران واپس آ جاتے! ——— ماری یا مری، دیالہ اور اُر کے علاوہ جو ان کی تجارت کے خاص خاص مراکز تھے۔ غالباً یہ لوگ اپنا

سامان عیلام کے پایہ تخت سوسٔش کے بازار میں بھی پہنچاتے تھے۔ ان قدیم مکرانی تاجروں کی نظر میں سوپٹامیہ یعنی وادی عراق کو جو اہمیت حاصل تھی۔ اس کا اندازہ اس امر سے لگایا جاسکتا ہے کہ سمیریا میں ان کی ایک مختصر چھوٹی سی مستقل نوآبادی تھی۔ مکران اور سمیریا کے یہ تجارتی تعلقات تقریباً ۳۰۰۰ قبل مسیح ہی میں مستحکم ہو چکے تھے۔ اس وقت موئن جو دڑو وغیرہ کے تاجروں کا اس میں کوئی دخل نہیں ہوا تھا کیونکہ وادی سندھ اور سمیریا کے تجارتی تعلقات کا پتہ ۲۵۰۰ قبل مسیح کے بعد سے ملتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ اس سے پہلے مکران کی برآمدی تجارت کن چیزوں پر مشتمل تھی۔ اس کے جواب میں ہم پھر خاموشی اختیار کر لینے پر مجبور ہیں۔ تاہم مری، اُر، اور کیش سوپٹامیہ اور سوسٔش وغیرہ کے آثار سے جو کچھ دریافت کیا جاسکا ہے وہ یہ ہے کہ مکران کی برآمدات میں قیمتی مسالے، مختلف قسم کی خوشبودار چیزیں اور حجری و گلی ظروف بڑی اہمیت رکھتے تھے۔

۲۵۰۰ قبل مسیح کے بعد موئن جو دڑو کے تاجروں نے بلوچستان کی طرف بڑھنا شروع کیا اور ۲۳۰۰ قبل مسیح تک انہوں نے سمیریا سے اپنے تعلقات قائم کر لئے۔ مغرب کی طرف ان کی آخری تجارتی چوکی ستکاگن ڈور تھی جو دریائے دشت کے مشرقی کنارے پر ساحل کے قریب ہی واقع تھی۔ قدرتی طور پر مکران کے تاجروں کی وہ پہلی حیثیت برقرار نہ رہ سکی۔ لیکن اس کا ایک دوسرا اہم نتیجہ یہ ہوا کہ جنوب مغربی بلوچستان کے علاوہ وسطی بلوچستان کا ایک وسیع علاقہ وادی سندھ کی بعض اہم ضرورتوں کو پورا کرنے کے لئے کھل گیا۔ اور بلوچستان سے رال، سنگ جراحت

اور غالباً ایک قسم کی ابرق بھی وادی سندھ میں درآمد ہونے لگی تھی موئن جو دڑو والے فارس سے جو خام چاندی، سونا، ٹین اور سیسہ وغیرہ منگاتے تھے غالباً وہ بھی بلوچستان ہو کر وہاں پہنچتا تھا۔ اس کے علاوہ وادی سندھ میں جنوبی بلوچستان سے ایک اور اہم شے بھی برآمد کی جاتی تھی اور وہ حسین کنیزیں تھیں۔

وادی سندھ میں ترکستان اور افغانستان سے بھی تجارتی کارواں آتے تھے۔ یہ عموماً وسطی بلوچستان سے ہو کر درۂ مولا سے میدان سندھ میں آتے اور پھر جنوب کی طرف مڑ کر کرتھار کے کنارے کنارے چلتے ہوئے جوہی جا پہنچتے تھے۔ یا پھر نال اور وادی مشکی کی طرف سے نمودار ہو کر پھوسی اور روہل کے دروں کے راستے میدان میں وارد ہوتے تھے۔ ان دو قدیم تجارتی راستوں کے علاوہ ایک تیسرا اہم راستہ دریائے گاج کے ساتھ ساتھ بھی تھا۔

وادی سندھ ۳ ہزار قبل مسیح میں دو عظیم سلطنتوں کا گہوارہ تھی۔ ایک ہڑپہ کی سلطنت جو راوی کے مشرقی کنارے واقع تھی۔ اور دوسری موئن جو دڑو کی سلطنت جس کے پُرعظمت آثار لاڑکانہ کے جنوب میں دریائے سندھ کے مغربی کنارے پر دکھائی دیتے ہیں۔ ہڑپہ اور موئن جو دڑو دراصل ایک واحد عظیم الشان مملکت کے دو ہمعصر پایہ تخت تھے۔ ان کے علاوہ اس میدان میں بے شمار چھوٹے بڑے شہر تھے۔ اگر ہم وادی سندھ کو ایک آسمان تصور کر لیں تو ہڑپہ اور موئن جو دڑو اس کے آفتاب و ماہتاب تھے۔ اور یہ سارے شہر

اس کے جگمگاتے ہوتے ستارے۔ ان ستاروں کا ایک سلسلہ موئن جودڑو کے جنوب میں سندھ کے مغربی کنارے موجودہ کراچی تک کہکشاں کی صورت پھیلا ہوا تھا۔ وسطی اور جنوب مغربی بلوچستان، کرتھار کے دروں کے ذریعہ اس کہکشاں کو مس کرتا ہوا موئن جودڑو کو چھو لیتا تھا۔ اسی طرح شمالی بلوچستان میں وادئ ژوب، کوہ سلیمان کے زینوں سے اتر کر، ہڑپہ سے بغل گیر ہو جاتی تھی۔ یہاں وادئ سندھ اور بلوچستان کے ایک دلکش تضاد کو بھی پیشِ نظر رکھتے۔ ہمارا بلوچستان چھوٹی چھوٹی منتشر اور کم و بیش بے تعلق زرعی آبادیوں کا مجموعہ تھا اور میدان سندھ ایک وسیع و عریض، متحد، شہری تہذیب کا گہوارہ! یہ دو الگ الگ تاریخی و تہذیبی خطے نہیں تھے بلکہ دو روشن متوازی لکیریں تھیں جن کو پاکستانی علاقہ کے قدیم باشندوں نے اس برصغیر کی تاریخ کے پہلے صفحہ پر کھینچا تھا۔

ژوب کے ان آثار کا ذکر کرتے ہوتے جو رانہ غنڈئی میں پائے جاتے ہیں۔

ہم نے کہا تھا کہ اس کے تیسرے دور کے اختتام پر یعنی سنہ ۲ ہزار قبل مسیح کے قریب تباہی، بربادی، اور لوٹ مار کے نشانات ملتے ہیں۔ اس عہد میں اسی قسم کے آثار دوسری جگہ بھی ملتے ہیں۔ ان بربادیوں کے آثار نہیں جو دریاؤں کی عارضی طغیانی، تبدیل آب و ہوا اور وباؤں وغیرہ کے سبب ترک سکونت سے نظر آتے ہیں۔ ان کی تہہ میں بربریت کی ایک المناک داستان چھپی ہوئی معلوم ہوتی ہے کیونکہ رانہ غنڈئی کے علاوہ وسطی بلوچستان بھی اکثر قدیم آثار پر راکھ کا دبا دبا ڈھیر پایا جاتا ہے جیسے کسی نے گاؤں کے گاؤں جلا کر خاک کر ڈالے ہوں۔ اگر آپ نال کے

کھنڈر کو غور سے دیکھیں تو آپ کو اس کی زمین تک آگ میں جل جانے کے سبب سرخ نظر آئے گی۔ چنانچہ اس کا نام ہی سور ڈمب یعنی "سرخ کھنڈر" پڑ گیا ہے۔ جنوبی بلوچستان میں کھدائی کا کافی کام نہ ہونے کی وجہ سے اب تک اس پُراسرار آتش زدگی کے نشان نہیں مل سکے۔ لیکن یہاں بھی عام تباہی و بربادی کا ثبوت موجود ہے۔ صرف یہی نہیں بلکہ جس جگہ بھی خاک کے ڈھیر اور راکھ کی تہیں ملتی ہیں وہاں کی بالائی تہہ سے برآمدہ چیزوں کے رنگ ڈھنگ میں ایک بے جوڑ تغیر اور اجنبیت پائی جاتی ہے۔ تربت کے پاس شاہی تمپ کے کھنڈر سے جو سنہ ۲ ہزار قبل مسیح کے لگ بھگ وادئ سندھ کے زیر اثر تھا، ایک اور حیرت انگیز چیز ملی ہے ــــــ ایک کاسۂ سر جو غیر مانوس، بدیسی ہتھیار کے ساتھ زمین میں دفن تھا! ماہرین کے معائنہ سے معلوم ہوا کہ یہ کاسۂ سر کیسپین یا نارڈک نسل کے کسی انسان کا ہے۔ یہ کیسپین نسل کی کھوپڑی والا انسان بلوچستان کیا کرنے آیا تھا؟ یہ کوئی سیاح تھا، تاجر تھا یا حملہ آور؟ اس کا جواب دینے سے پہلے ہمیں اس عہد کے مغربی ایشیا پر ایک طائرانہ نظر ڈالنی ہوگی۔

سنہ ۲ ہزار قبل مسیح کے لگ بھگ کا زمانہ ہے۔ وادئ عراق میں سارگن کا اکادی تخت متزلزل ہے کیوں اس کے بیٹے نارم سن کی موت کے بعد "گوتی" اور دوسرے وحشی قبائل اس کی مملکت میں در آتے ہیں۔ ان وحشیوں کی یلغار اتنی شدید اور مہیب ہے کہ ایک دو صدی بعد اُر کے تیسرے خاندان کا خوفزدہ

وقائع نگار ان کے متعلق یہ الفاظ لکھتا ہے: "وہ غول جن کے حملوں میں آندھی، طوفان کا زور ہے، ایک ایسی قوم جس نے کبھی کسی شہر کی صورت نہیں دیکھی۔" شام میں بھی یہی ہلچل مچ رہی ہے ایشیائے کوچک میں ایک بدیسی سلطنت زور پکڑ رہی ہے۔ ادھر فارس میں حصار کے دور دوم کے نووارد رسوم میں اپنے غیر مانوس تہذیبی عناصر کو مستحکم کر رہے ہیں۔ شمال میں روسی ترکستان سے لے کر بحر کیسپین تک لاتعداد جنگجو قبیلے گشت کر رہے ہیں۔ ان کے پاس گھوڑے ہیں، رتھ ہیں، اور مہلک ہتھیاروں کے ساتھ ملک گیری کا عزم اور فتح مندیوں کا چڑھتا ہوا نشہ بھی ہے اور ان سب کے علاوہ کچھ اور بھی ہے، احساس و ادراک کے نئے سانچے، جذبات اور تخیل کے نئے اسلوب، نیا زاویۂ نگاہ، اور نئی زبان۔"

ان جنگجو، وحشی اور غیر مدنی قبائل کو آپ اب پہچان گئے ہوں گے یہ وہ لوگ ہیں جنہیں تاریخ "آریہ" کہتی ہے۔ مغربی ایشیا کی طرح بلوچستان کو تاخت و تاراج کرنے والے بھی یہی تھے۔ وسط ایشیا اور جنوبی روس کے گیاہستان سے نکل کر جب "آریہ" ایران میں داخل ہوتے تو آخر الذکر علاقہ سے آنے والے جو "میڈ" کہلاتے ہیں، مملکت یرارتہ کے مغرب میں آباد ہو گئے "میڈیا" انہیں نوواردوں کی آریائی سلطنت تھی۔ پہلے علاقہ سے آنے والے آریہ جو خراسان کے شمال سے آئے تھے، کرمان ہوتے ہوتے فارس پہنچ گئے۔ ان کا تیسرا گروہ باختر سے جنوب مشرق کی سمت مڑا اور ہندوکش کے سلسلوں کو پار کر کے مغربی پنجاب

میں آدھمکا۔ فارس پہنچنے والے آریاؤں کے کئی قافلے مشرق کی طرف مڑ گئے اور پیہم یلغار کرتے ہوئے آراکوشیہ (جنوبی افغانستان) درنجیانہ (جنوبی افغانستان اور شمالی مغربی بلوچستان، سیستان وغیرہ)، اور گدروشیہ (مکران) میں گھس آئے۔ شمالی و جنوبی بلوچستان کے قدیم باشندوں نے ان کا مقابلہ کیا۔ حملہ آوروں نے اس کا جواب شدید تر حملوں سے دیا۔ حملے، دفاعی حملے، دفاع کے جوابی حملے، قتل، غارت گری اور آتش زنی کا یہ سلسلہ کئی صدیوں تک جاری رہا۔ آخر کار بلوچستان کے بے گناہ باشندے ترک وطن کر کے کہیں اور پناہ لینے پر مجبور ہو گئے۔ شمال اور مغرب کی طرف سے تو ان پر حملے ہی ہو رہے تھے، جنوب کی طرف سمندر راستے روکے کھڑا تھا۔ بس ایک مشرق میں وادئ سندھ تھی جو ان کو پناہ دے سکتی تھی۔ چنانچہ یہ مظلوم اور مجروح النسان، نیم جان قافلوں اور نڈھال کاروانوں کے لامتناہی سلسلوں کی صورت میں بولان، مولا، پھوسی اور روہل کے دروں سے گرتے پڑتے میدان سندھ میں پناہ لینے لگے اور ہڑپہ، موہن جو دڑو، اور ان کے "کہکشانی شہروں" نے ان خانماں بربادوں کے لئے امن، محبت اور اخوت کے دروازے کھول دیئے ______ آریاؤں کی اس غارت گری اور بلوچستان کے مظلوم باشندوں کے ساتھ پنجاب و سندھ کی اس محبت آگیں دست گیری و مسیحائی کی یہ تصویر کتنی پرانی ہے۔ مگر اس میں ایک کتنا نیا رنگ پیدا ہے! ہماری تاریخ کتنی نئی ہے مگر اس میں بھی ایک کتنی پرانی صدائے بازگشت پنہاں ہے۔

لیکن بلوچستان کے باشندوں کو سندھ اور پنجاب میں پناہ لینے کے بعد بھی چین نصیب نہیں ہوا۔ سلیمان و کرتھار کی سنگین جھلملی سے آریہ یہ دیکھ رہے تھے کہ سندھ و پنجاب ایک لہلہاتا ہوا فردوس ہے، یہاں لہلہاتے ہوئے کھیت ہیں، گنگناتے ہوئے پُرسکون اور حیات آفریں دریا ہیں اور ان کے مفتوحہ و مقبوضہ بلوچستان میں، جو اس وقت تک فضائی تغیرات کا شکار ہو چکا تھا، صرف بنجر پہاڑ ہیں، ریگستان اور صحرا ہیں۔ اس اختلاف کو دیکھنے اور سمجھ لینے کی دیر تھی کہ آراکوشیہ، درنجیانہ اور گدروشیہ کے آریائی قبیلے ایک نئی تیزی اور تندی کے ساتھ میدان پر حملہ آور ہو گئے۔ موئن جو دڑو اور ہڑپہ یعنی وادیٔ سندھ کی وہ عظیم الشان اور اولین مملکت اپنی قدامت، جمود، اور داخلی انحطاط کا اس حد تک اسیر ہو چکی تھی کہ وہ اس یورش کی تاب نہ لا سکی۔ دیکھتے ہی دیکھتے اس کا شیرازہ بکھر گیا اور اس کے باشندے یا تو لڑتے لڑتے ختم یا مشرق میں گنگا اور جمنا کی وادیوں کی طرف پناہ کی تلاش میں نکل کھڑے ہوئے ــــــ اور ان کے پیچھے پیچھے آریہ بھی بڑھتے رہے!۔

یہ سب کچھ ۲ ہزار اور ۱۵۰۰ قبل مسیح کے درمیان رونما ہوا۔ ایک دو صدی اور گذری تھی، بلوچستان کی گویا کایا ہی پلٹ گئی۔ یعنی یہ آریہ دیس بن گیا ــــــ اس سے پہلے بلوچستان اندھیرے میں روپوش تھا لیکن اس کے بعد تاریخ کی مدھم مدھم جوت اس کے چہرہ پر پڑنے لگی۔ اور کچھ جھلکیاں تاریخ کی اس چلمن سے باہر پڑنے لگیں ■

بلوچستان کی ہیئتی حیثیت

متحدہ ہندوستان کے جو علاقے سیاسی، معاشی اور دیگر غفلتوں کا شکار رہے اور جنہوں نے خاصا نقصان برداشت کیا، ان میں 'بلوچستان' کی محرومیاں سب سے زیادہ تھیں۔ جس کی ایک وجہ اس وقت کے دارالسلطنت سے اس کی دوری، کسی حد تک اس کی جبلی نوعیت اور ایک غیر ملکی حکومت کے لئے یہاں کے باشندوں کا نام نہاد "حریفانہ" رویہ تھا۔ ۱۸۳۹ء اور ۱۸۷۸ء کی جنگ افغان نے بلوچستانی علاقے کی فوجی اہمیت کو مستحکم کر دیا تھا۔ اور انجام کار برطانوی اقتدار قائم ہو جانے کے بعد ترقیاتی سرگرمیاں شروع کر دی گئی تھیں۔ لیکن یہ ترقیاتی سرگرمیاں ہمیشہ برطانوی ہندوستان کے مغربی محاذ اور اس سے منسلکہ وسیع تر دفاعی اقدامات کا حصہ رہیں۔ اور برطانوی حکمرانوں نے یہاں کے عوام کی معاشی اور سماجی بہتری کی شاید ہی کوئی کوشش

کی۔ حقیقت تو یہ ہے کہ غیر معمولی طور پر یہی سنا جاتا ہے کہ یہی تھے جنہوں نے بلوچستان کو ایک پس ماندہ علاقہ بنا دیا تھا۔

جب ہندوستان تقسیم ہوا تو وہ ایوان کہنہ بھی منہدم ہو گیا، اور بہتر بھی یہی تھا۔ ایک نیا نظام قائم ہوا اور ایک نئی تاریخ کی ابتدا ہوئی۔ لازم ہو گیا کہ سابقہ جغرافیائی پہلو اس کی عملی قدر بدل جائے۔ کل جو پرانے دار الخلافہ دہلی سے بہت دور اور الگ تھا آج نئے دار الخلافہ کراچی سے نزدیک اور قریب ہو چکا تھا۔ پیمائش خطِ مستقیم سے کی جائے تو کوئٹہ، دہلی سے ۷۰۰ میل دور تھا۔ پر اب کراچی سے اس کا فاصلہ ۳۰۰ میل سے بھی کم رہ گیا تھا۔ اور بلوچستان کے باشندوں کا وہ "حریفانہ" رویہ فطری طور پر بدل کر نئی حکومت کی امنگوں سے ہم آہنگ ہو گیا تھا کیونکہ یہ ان کی اپنی حکومت تھی۔ قیام پاکستان کے بعد بلوچستان اب صرف فوجی چوکی نہ تھا۔ اسے پاکستان کے جزوِ لاینفک کی حیثیت حاصل ہو چکی تھی۔ اس طرح یہ کوئی حیران کن بات نہیں کہ بلوچستان ایک نیا طرز زندگی اختیار کر چکا ہے۔ سیاسی اصلاحات نافذ کی جا چکی ہیں۔ اور زرعی، صنعتی و دیگر ترقیات کا عمل جلد ہی شروع ہو جائے گا۔

اس نئے جوش و خروش میں ہو سکتا ہے، ہم ایک بات بھول جائیں۔ یعنی اس خطے اور اس کی فطری ساخت کو۔ ہم بڑے خلوص کے ساتھ اس نئے عہد کو خوش آمدید کہتے ہیں جو بلوچستان میں شروع ہو چکا ہے۔

لیکن ہمیں اپنے آپ کو اور دوسروں کو، یہی یاد دلاتے رہنا چاہئے، جیسا گوپلٹ اپنی کتاب "عہد ناموں کی شفق" میں لکھ گیا ہے۔ وہ لکھتا ہے "کوئی پالیسی سیاسی جغرافیہ کے بغیر مکمل نہیں ہو سکتی اور نہ سیاسی جغرافیہ بغیر طبعی و انسانی جغرافیہ کے"۔

چنانچہ مندرجہ ذیل صفحات میں اس امر کی کوشش کی گئی ہے کہ بلوچستان کی ہیئت کے مختلف پہلوؤں کو اجاگر کیا جائے کیونکہ بلوچستان کو آنے والے "کل کی زمین" کہا جا سکتا ہے۔

مغربی پاکستان سے ہیئتی تعلق

ہیئتی زاویہ نگاہ سے مغربی پاکستان کو دو بڑی اکائیوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ (الف) سندھ اور اس کے معاون دریاؤں کا میدان اور (ب) کوہستانوں اور سطح مرتفع کا ایک جنگل جو حصہ الف کے مغرب اور شمال مغرب میں واقع ہے۔ دوسرے حصے کا وہ ٹکڑا جو براہ راست سندھ کے مغرب میں واقع ہے خود دو چھوٹے بڑے حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ ان کی حد بندی، کسی حد تک، دریائے گومل کے تنگ نالے سے ہو جاتی ہے۔ دریائے گومل کے جنوب میں ایک عظیم سطح مرتفع ہے۔ ساتھ ہی ساتھ پہاڑوں کا پیچیدہ ایک سلسلہ ہے جو ہر جانب پھیلا ہوا ہے جن کے درمیان سطح سمندر سے ۱۰۰۰ تا ۳۰۰۰ فٹ کی بلندی

پر کئی طاس واقع ہیں۔ ان میں سے بعض کی اونچائی ۵۰۰۰ فٹ ہے۔ ایک عام بات یہ ہے کہ یہ سطح مرتفع جنوب مغرب میں بتدریج نیچی ہوکر ایرانی ریگزاروں میں ضم ہوجاتی ہے، جب کہ جنوب میں ساحل کے متوازی پہاڑوں کے پار بحر عرب سے ملتی ہے۔

ایک چھوٹے سے متداخلی (RE-ENTRANT) حصے کو مستثنیٰ کردیجئے جو زیادہ سے زیادہ مشرق میں واقع کوہِ سلیمان اور کرتھار کے کوہستانی محاور کے درمیان ہے تو یہ سارا خطہ ایران کے سطح مرتفع کا حصہ بن جاتا ہے۔ اور جنوب مشرقی ایشیا کے ہیئتی خط و خال میں سب سے زیادہ نمایاں ہوجاتا ہے۔ متذکرہ بالا متداخلی ٹکڑے کو شامل کرتے ہوئے یہی خطہ جس کا رقبہ ۱۳۴۰۰۰ (ایک لاکھ چونتیس ہزار) مربع میل ہے ہمارے لئے ایک جغرافیائی صوبہ "بلوچستان" بنا دیتا ہے۔

ارضیاتی مبدا

یہ بھی ایک عجیب اتفاقی مطابقت ہے کہ ایک طرف بلوچستان پاکستان کی ایک سیاسی اکائی ہے تو دوسری طرف مشترکہ ارضیاتی مبدے نے ان دونوں کو متحد کردیا ہے۔ ہماری زمین کی جن قوتوں اور حرکات نے مشرقی اور مغربی پاکستان کی سرزمین بنائی وہی بلوچستان کی پیدائش کا سبب بن گئیں۔

جن ہیئتی اکائیوں کا ذکر کیا گیا وہ دراصل ماضی بعید کی عظیم قشری حرکات کے نتیجے کے طور پر ظہور پذیر ہوتے۔ لاکھوں سال ہوئے، اس زمین پر ظہور انسانی سے بھی قبل 'مغرب میں' موجودہ پہاڑوں کا انبار اور سطح مرتفع، شمال میں ہمالیہ اور اس کا وہ سلسلہ جو مشرقی پاکستان سے گذر کر برما تک گیا ہے، یا سندھ اور گنگا کا یہ زرخیز میدان، ان سب کا کوئی وجود نہ تھا۔ ان سب کی جگہ ایک وسط ایشائی سمندر یعنی "بحیرۂ ٹیتھس" نے لے رکھی تھی۔ جیسے، ایک وسیع و عریض بحیرۂ روم بل پہ بل کھاتا ہوا دنیائے قدیم کے قلب میں بھی واقع تھا اور بحر اوقیانوس کو بحر الکاہل سے ملاتا تھا۔ غالباً یہ دو سمندر بھی اپنی موجودہ حالت میں اس وقت نہ تھے۔ بہرصورت یہی قدیم یا کلاسیکی سمندر یعنی بحیرۂ ٹیتھس جنوب میں واقع سرزمین "گونڈوانا" اور شمال کی سرزمین "لورنشیا" کو ایک دوسرے سے الگ کرتا تھا۔ یہ دونوں بری کمیت زمین کے اولین قشری بلاک تھے۔ اگرچہ ان کی بقیہ تاریخ بڑی حد تک الجھی ہوئی ہے، لیکن ہم اپنا یہ استدلال قائم رکھ سکتے ہیں کہ جزیرہ نمائے ہند اس سرزمین گونڈوانا کی ارضیاتی میراث ہے، جو ماہرین ارضیات کے مطابق برازیل کے سطحِ مرتفع سے لے کر افریقہ، عرب، جنوبی ہند اور مغربی آسٹریلیا تک پھیلی ہوئی تھی یا کم از کم سیل زدہ اور دور افتادہ ارضی خطوں کا ایک مجموعہ تھی۔ اسی طرح شمال میں آج جہاں "روسی پلیٹ فارم" اور سائبیریا کا وسطی ماسف ہے

اور جسے ہم سرزمینِ "انگارا" کہتے ہیں کسی قدیم تر قشری بلاک کا بچا کھچا حصہ ہے۔ آگے چل کر ہمیں یہ نتیجہ اخذ کرنا پڑتا ہے کہ ٹیتھس کا فرش دراصل ایک عظیم طاس کی شکل میں تھا جہاں ہمسایہ بری کمیت کا عطا کردہ حجری ملبہ، کیچڑ اور دیگر مواد جمع ہوتا تھا۔

ثلاثی عصر کے دوران اس تمام خطے کے توازن ہم استادگی میں بری طرح خلل پڑا جو ٹیتھس کے حوالے تھا۔ فطری طور پر اس توازن کی بحالی کا عمل بھی شروع ہوا۔ اور لگے ہوئے قشراتِ ارض میں حرکات کی ابتدا ہوئی۔ ان حرکات کے نتیجے میں بحیرۂ ٹیتھیس کے فرش پر بتدریج ابھار پیدا ہوا۔ آہستہ روی مگر ثابت قدمی کے ساتھ زمین سطحِ آب سے اوپر ہلکے ہلکے خم کے ساتھ نمودار ہوئی۔ ان خموں کا حیطہ بڑھتا رہا تاآنکہ پلائسٹوسینی دور میں انہیں اپنی موجودہ صورت اور تقسیم حاصل ہوئی۔ اور یوں پاکستان اور اس سے پرے علاقوں کی عمومی سرحدیں ظاہر ہوئیں تو اس طرح بلوچستان بھی اپنے آبی جنین سے ظاہر ہوا۔

لیکن بلوچستان میں بعد کے واقعات کا انداز پنجاب اور سندھ کے میدانوں سے مختلف تھا۔ جہاں تک آخرالذکر کا تعلق ہے یہاں بڑی ہمواری مگر سست روی کے ساتھ ہمالیائی دریاؤں کے لائے ہوئے مواد کی انداخت کا عمل، بناوٹ کے دیگر طریقۂ کار سے نمایاں رہا۔ بلوچستان میں اس طرح کی سادہ انداخت کو کبھی کوئی برتری حاصل نہ ہوئی۔ حالانکہ اس کا

اپنا مقامی نظم قائم تھا۔ یہ اور بات ہے کہ یہ نظر انداز کیا جا سکتا ہے۔

شکلیاتِ سطح کی نشوونما

پیشِ نظر خطے کی نمو اور ارتقاء ان تین بنیادی اجزاء کے نتائج کا مرکب تھا، جنہیں ہم "قوت" بھی کہہ سکتے ہیں۔ ان میں اوّل وہ ہیئتی قوت تھی، جس نے وسیع تر منظر کا ایک پہلو ہوتے ہوئے خروج بلوچستان کے اسباب مہیا کئے؛ دوئم آتشی اور آتش فشانی قوتیں، اور آخری یعنی موسم زدگی اور زمینی شکست و ریخت۔ یہاں یہ تو ممکن نہ ہو سکے گا کہ ہم ان تمام قوتوں کا تفصیلی جائزہ پیش کریں، جنہوں نے بلوچستان بنایا۔ تاہم ہمیں اپنی توجہ قوتوں کے ان ممتاز طریقہ ہائے کار کی طرف مبذول کرنی چاہیئے۔ جو ایسا محسوس ہوتا ہے، بلوچستان کی شکلیاتِ سطح کی نمو میں ہاتھ بٹاتے رہے اور اسے منضبط کرتے رہے۔

کوہ ساز قوتیں اور انکے خِطہ وار مدعا علیہم

ہم پہلے ہی ان قشری حرکات کا ذکر کر چکے ہیں جنہوں نے بحیرۂ ٹیتھس کے فرش کو خمدار کیا اور اسے اتنا اونچا کر دیا کہ دنیا کے نوعمر خمدار پہاڑوں کا سب سے اونچا سلسلہ قائم ہو گیا۔ اب یہی گمان ہوتا ہے کہ بڑے پیمانے پر ان حرکات کا ایک خاص انداز تھا۔ مغربی سمت میں دیکھئے تو یقیناً افریقہ کا

"عقبی علاقہ" یورپ کی "پیش ۔ارض" کی جانب حرکت میں آیا ہوگا۔اور مشرقی جانب ارض "انگارا" نے جزیرہ نمائے ہند کے قائم بلاک کے مقابل حرکت کی ہوگی۔ بہ الفاظِ دیگر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس طرح بحیرۂ ٹیتھس دو منطقوں میں منقسم ہوگیا۔ ہر منطقہ ملحق قشری بلاکوں میں سے کسی ایک بلاک کی یکساں حرکات کا تابع ہوا ۔مگر ان حرکات کی سمت مخالف تھی۔اس طرح یہی نتیجہ نکالا جاسکتا ہے کہ ان دو منطقوں کے درمیان ٹیتھس کا وسطی منطقہ تھا۔جو دراصل ایک ایسے علاقے کی نیابت کرتا تھا جہاں حرکات کی سمت آڑی ترچھی تھی۔یہیں ان دو الگ الگ منطقوں میں اُبھرنے والی لہروں کا ایک سنگم بنا۔ اس طرح مغربی اور مشرقی منطقوں میں اُبھرنے والے خم ایک دوسرے سے مدغم ہوکر ایسے ہی ایک نئے سلسلے دخم اکا باعث بنے جو اکثر اوقات ان دورافتادہ منطقوں میں اپنے "آبائی" خم سے بلحاظ سمت بالکل مختلف ہوگئے۔

یہاں ایک اور قشری بلاک یعنی جزیرہ نمائے عرب کے فیصلہ کُن کردار کا ذکر بھی ضروری ہے۔افریقہ اور جزیرہ نمائے ہند کے درمیان واقع اس عربی بلاک نے مزاحمت کرنے والے بلاک کی حیثیت اختیار کرلی یعنی اس کی جانب بڑھنے والے خم اپنی ابتدائی سمت تبدیل کردینے پر مجبور ہوگئے ۔اس طرح پہلی بار جب ان خموں کا رُخ بدل گیا تو یہی رجحان قائم رہا جس کے باعث ایک نیا کوہ ساز انداز ظہور میں آیا۔ یا پھر ہم یہ کہہ سکتے ہیں

کہ یکے بادیگرے ان خموں نے جزیرہ نمائے عرب کی پیش کردہ مزاحمت کی طبعی افتاد اور شدت کے مطابق اپنے لئے گنجائش پیدا کرلی۔اس کے ساتھ ہی بعض ناقابل توضیح رُکاوٹوں نے بھی ان خموں کی "روانی" کو متاثر کیا۔ان سب باتوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ بحیرۂ ٹیتھس کے اس فرشی ٹکڑے کو ایک عجوبہ ہلچل نے اونچا کردیا اور بلوچستان بنادیا۔ یا یوں کہا جائے کہ ان گوناگوں حرکات کے درمیان یہ ٹکڑا "کچل" دیا گیا جس کے نتیجے میں اتنے اونچے خم بن گئے یعنی یہ کوہستانی سلسلے۔جو اس حد تک مروڑ دیئے گئے کہ مرغولہ جیسے ہوگئے۔ اگرچہ یہ بیان قیاسی ہے لیکن ان پہاڑوں کی عام وضع سے اس بات کی واضح تائید ہوتی ہے کیونکہ ان کی وضع انگریزی کے حرف "S" سے مشابہ ہے۔مشرقی جانب کوہِ سلیمان زینوں کی طرح بتدریج "تختِ سلیمان" تک پھیل گیا ہے۔ پھر یہ پہاڑ ژوب ندی کے شمال میں "ٹوبہ کاکڑ" سلسلے کے ساتھ اس مقام تک جہاں تقریباً وسطی "براہوئی" سلسلہ آجاتا ہے مغرب کی سمت گھوم جاتا ہے۔ کوئٹہ کے نزدیک اس کی سمت شمالاً جنوباً ہوجاتی ہے۔لیکن تقریباً ۶۶° درجہ مشرقی طول البلد سے اس کی سمت مکران اور خاران میں دوبارہ رکسی حد تک اغربی ہوجاتی ہے۔وسطی براہوئی سلسلہ، ۲۶° ۵۷' و ۳۰° ۲۶' ۳۳" شمالی اور ۶۶° ۳۱' و ۶۷° ۲۶' ۵" مشرقی) کے درمیان واقع ہے۔جس میں مولا ندی "پشن لورا" اور ژوب ندیوں کے درمیان کا سارا پہاڑی علاقہ

شامل ہے۔

غور سے دیکھا جائے تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ "ہربوئی" پہاڑیاں جو قلات میں واقع ہیں ایک "گرہ" بناتی ہیں۔ اس گرہ سے مختلف پہاڑوں کے سلسلے تقریباً ہر جانب پھیلتے ہیں۔ ایک شمال کی جانب پھیلا ہوا ہے جب کہ جنوب مغرب میں تین چار سلسلے کرنوں کے انداز میں پھیل کر "سیاہان" اور مکران کے سلسلے بناتے ہیں۔ یہ سلسلے ایک دوسرے کے علاوہ ساحل کے متوازی ہیں۔

شمالی ترین علاقے میں چاغی کا سلسلہ اور خصوصی طور پر کوہِ راس اس تصویر کو مکمل کر دیتا ہے۔ جب کہ جنوب مشرقی سمت میں واقع "پب" کے سلسلے کو آخری چوکی یا ہربوئی کی ایک شاخ کہا جا سکتا ہے۔ کوئٹہ کے شمال مشرق میں ایک اور گرہ نظر آتی ہے جو ارتفاع میں زیادہ ہے اور "زرغون" (۱۱۷۳۸ فٹ) اور خلیفت (۱۱۴۴۰ فٹ) جیسی بلند چوٹیوں کو اپنے کاندھے پر سنبھالے ہوتے ہے۔ مشرق میں سلیمان اور کرتھر کی طویل دیوار پھیلی ہوئی ہے جو آگے چل کر بحر عرب کی سطح کے نیچے بالآخر مغرب کی سمت مڑ کر خلیج عمان تک پھیلی ہوئی ہے۔

مختلف سمت میں پھیلے ہوئے ان پہاڑوں کی گود میں بلوچستان کا طاس، اس کی وادیاں اور اس کے میدان واقع ہیں۔ شمال مشرق سے اگر ان کا شمار کیا جائے تو ژوب اور لورالائی کی ۵۰۰۰ فٹ بلند (سطح سمندر سے) وادیاں

ملتی ہیں شمال میں وادیٔ شال ہے (عرفِ عام میں جسے کوئٹہ کی وادی کہتے ہیں) یہ بھی ۵۰۰۰ فٹ کی بلندی پر واقع ہے۔ جنوب مشرقی سرے پر لسبیلا کا میدان ہے۔ جب کہ مغرب کی جانب ہمیں ایسے ریگزاروں اور پتھریلے میدانوں کا یکے یادیگرے سامنا کرنا پڑتا ہے جنہیں متوازی پہاڑی سلسلے ایک دوسرے سے جدا کرتے ہیں۔ ان میں جو بڑی وادیاں اور طاس ہیں وہ دراصل وادیوں یا طاس کا مجموعہ ہیں، جن میں سے ہر ایک میں ایک یا دو ندی نالے ضرور واقع ہیں۔ جو سال کے بیشتر حصوں میں خشک رہتے ہیں۔

یہ علاقہ بڑے پیمانے پر کچلا یا نچوڑا گیا جس کے باعث یہاں کے پہاڑوں اور منسلکہ وادیوں کی خصوصی ہیئت اُبھری اور اسی کے نتیجے میں یہاں کی حجری کمیت میں بڑے پیمانے پر اچھال یا دھکیل (THRUST) برانداخت (OVER THRUST) خطا (FAULT) اور شگاف کا عمل داخل ہوا۔ ان کوہستانی سلسلوں کی جہت (STRIKE) پر عمودی حالت میں جہاں سرکاؤ واقع ہوا وہاں ندیوں کے لئے راہ ہموار ہو سکی، جس کی مثال بولان اور ناری سے ملتی ہے۔ درحقیقت بلوچستان ہمالیہ کی عظیم سرحدی خطا پر واقع ہے۔ اور ساحل بھی ایسی ہی خطاتی خط پر منطبق ہو جاتا ہے۔ ہم اس بات کو ان الفاظ پر ختم کر سکتے ہیں جن سے ان اثرات کی وسعت کا اظہار بخوبی ہو جاتا ہے۔ سطح مرتفع "سارلاٹھ" اور ٹوبا کا غربی کنارہ کسی بڑی خطا کا مظہر ہے جس کے ساتھ عظیم ریگستان کا مشرقی کنارہ، ان بلند

سلسلوں کے مقابلے میں اضافی طور پر کئی ہزار فٹ نیچے جھک گیا ہے۔"

اس غیر قیام پذیر قشری پس منظر میں یہ امر قطعاً حیران کن نہیں کہ بلوچستان ہی وہ سرزمین ہے جہاں زلزلوں کا تواتر جاری ہے۔ جہاں تک زلزلوں کا تعلق ہے نہ تو ان کا شمار زمین کی کبیر قوتوں میں ہوتا ہے نہ کبھی ان سے کوئی بڑی بڑی شکل وضع ہو سکی ہے۔ پھر بھی اس میں کسی شک کی کوئی گنجائش نہیں کہ انسانی نقطۂ نظر سے ان کی بڑی اہمیت ہے۔ بلوچستان کے چند زلزلوں نے بڑے پیمانے پر تباہی پھیلائی ہے۔ مثلاً ۳۱ مئی ۱۹۳۵ء کا زلزلہ کوئٹہ کے لئے بڑا تباہ کن تھا۔ ۲۰ دسمبر ۱۸۹۲ء کو جو زلزلہ آیا تھا اس نے عام تباہی سے قطع نظر کوئٹہ سے چمن کے فاصلے کو ۲½ فٹ کم کر دیا تھا۔ لیکن ان زلزلوں میں چند ایسے بھی ہیں جن کے اثرات تعمیری تھے۔ مثلاً ۱۸۸۸ء میں جو جھٹکے کوئٹہ میں محسوس کئے گئے تھے ان کے زیر اثر "شورارود" کی چاچازئی کاریز کی آبی رسد میں اضافہ ہو گیا تھا۔ اسی طرح ۱۹۰۹ء کے زلزلیاتی جھٹکوں کے سبب "تکاتو" کی ڈھلوانوں پر واقع "سرغورغی" گاؤں میں ایک چشمہ برآمد ہو گیا۔

آتشی اور آتش فشانی قوتیں

آتشی قوتوں کے اثرات کا بہترین خلاصہ ان الفاظ میں پیش کیا جا سکتا ہے "ٹراسی شیل اور چونا پتھر کا ایک بڑا ابرزہ وادئ ژوب

کے جنوب میں واقع ہے اس سے یہی ظاہر ہوتا ہے کہ ان چٹانوں میں "دکنی ٹراپ" کے موٹے دانوں والے گیبرو، جو سرپنٹائن میں تبدیل بھی ہوئے ہیں، بے شمار ڈولیرائٹ اور بسالٹ کی رگوں اور رگ نما سد کی شکل میں ان کے درمیان دخل انداز ہیں۔ اسی زمانے کی کئی اور چٹانیں ملتی ہیں جن میں دخولی اور برکانی دونوں شامل ہیں اور جو خط واری اقسام میں خاصی میسر ہیں۔ آتشی چٹانوں کا دوسرا گروہ وہ ہے جنکی نمائندگی گہرائی میں واقع ان دخل انداز چٹانوں سے ہوتا ہے جن کا آتش فشانوں سے کوئی تعلق نہیں۔

ان آتشی قوتوں نے بلوچستان کو خالص ارضیاتی مفاد کے علاوہ معاشی اہمیت بخش دی ہے۔ سرپنٹائن میں جس کا ذکر پہلے کیا جا چکا ہے۔ کرومی۔ لوہے کی قیمتی کچ دھات دستیاب ہے۔ جب کہ سیسہ، تانبہ، گندھک اور آرا آتشی چٹانوں کی دیگر علاقوں کے علاوہ چاغی کے پہاڑوں میں بہتات ہے۔

آتشی قوتوں سے چٹانوں میں تبدیلی یا کایا بدلی نہ تو ہر شخص کو نظر آسکتی ہے نہ اسکے نتائج کا اندازہ کوئی غیر تربیت یافتہ شاہد لگا سکتا ہے۔ تاہم ان کا شمار اس خطے کے بنیادی پہلوؤں میں ہوتا ہے اور ہم ابھی دیکھ چکے ہیں کہ ان میں سے اکثر کا آتش فشانی قوتوں سے قریبی تعلق رہا ہے۔

بلوچستان الپائن۔ ہمالیائی آتش فشاں پٹی میں واقع ہے۔ اگرچہ ان آتش فشانوں میں زیادہ تعداد انکی ہے جو خالی ہو چکے ہیں یا بجھ چکے ہیں،

پھر بھی ان کا تعلق ایران، ترکی اور بحر رومی آتش فشانوں سے براہِ راست ہے۔ ہیئت یا شکلیات سطح کے لحاظ سے ان آتش فشانوں نے بلوچستان کو ایک امتیاز دے دیا ہے جب کہ بری شکل کے لحاظ سے پاکستان کے دیگر علاقوں کے مقابل ان کی اٹھان خاصی متضاد ہے۔ یہ آتش فشاں جو بلحاظ پیدائش حال اور ذیلی حال سے تعلق رکھتے ہیں بکھری ہوئی پہاڑیوں کا ایک سلسلہ ترتیب دیتے ہیں جو چاغی کے مغرب میں ایک مثلث نما علاقے میں واقع ہیں، اور انہیں مغربی سنجرانی کے نام سے جانا جاتا ہے۔ سب سے پہلے کوہِ سلطان ملتا ہے جسے چاغی کی خاص پہاڑیوں سے ۳۰ میل چوڑا ایک ریگزار علیحدہ کرتا ہے۔ مزید مغربی جانب داموون پہاڑیاں ہیں اور دیگر کئی ایسی چوٹیاں ہیں جو پیدائش کے لحاظ سے آتش فشانی ہیں۔ ان سے ۲۰ میل آگے ایک اور چوٹی ہے جس کا نام کوہ دلیل ہے۔ یہ سب کی سب ۴۰۰۰ تا ۸۰۰۰ فٹ اونچی ہیں اور ان میں سے چند ریتیلے میدانوں میں اپنی کھڑی ڈھلوانوں کے ساتھ بیساختہ اُبھری ہوئی ہیں۔ ان میں سب سے ممتاز کوہِ سلطان، سلطان پیر قیصر کے نام سے معنون ہے جو بلوچیوں کے درمیان روایتی سرپرست و صوفی مانے جاتے ہیں۔ اس سلسلۂ کوہ کے تفصیلی بیان کے لئے ہم مسٹر وریڈنبرگ کے ممنون ہیں جو درج ذیل ہے۔

"کوہ سلطان ایک بیضوی پہاڑ ہے جس کا محور اکبر اپنی مغرب۔ شمال مغرب جہت کے ساتھ ۱۷ میل لمبا ہے۔ اور اس کا عرض دس میل ہے۔

یہ ایک معدوم آتش فشاں ہے جس کی چٹانیں کوہِ تفتان کی چٹانوں سے مشابہ ہیں، لیکن ایک مخروط بنانے کے بجائے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اس کا مرکز خروج کئی بار بدلا۔ چنانچہ یہ پہاڑ دراصل تین ایسے مخروطوں کا مجموعہ ہے جو بڑی حد تک شکستہ ہیں، اور جن کے مراکز تقریباً ایک ہی خطِ مستقیم پر آراستہ ہیں۔ ان تینوں مخروط کی ابتدائی چوٹیاں مکمل طور پر عریاں کاری کی زد میں آچکی ہیں۔ مغربی مخروط کی عریاں کاری اس حد تک ہوئی ہے کہ اب یہ ایک کروی میدان کی شکل میں باقی ہے جس کا قطر ۴½ میل ہے اور جس کے گرد کھڑی چٹانوں کا ایک خوبصورت ایوان بن گیا ہے۔ یہ ان خط و خال کی مثال ہے جنہیں لیئل (LYELL) نے "کاسۂ عریاں کاری" کا نام دیا تھا۔ اس ایوان کے گرد جو کھڑی چٹانیں ہیں وہ تمام تر جمع شدہ راکھ کی پرتوں سے بنی ہیں۔ یہ ہر جگہ یکساں طور پر بلند نہیں ہیں، بلکہ عریاں کاری کے عوامل نے انہیں مختلف وضع قطع کا بنا دیا ہے۔ بعض ایسے حصے جو کم شکستہ ہیں علیحدہ علیحدہ انبار یا کمیت کی صورت میں یا ستونوں کی طرح نمایاں ہیں جیسے "نیزۂ سلطان"۔ وریڈنبرگ آگے رقمطراز ہے "بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مغرب سے مشرق کی جانب یہ تینوں مخروط یکے بادیگرے ظاہر ہوئے لیکن آتش فشانی اخراج غالباً جزوی طور پر بیک وقت ہوا ہو۔"

ان جسیم آتش فشانوں کے علاوہ، جو بہت اچھا ہوا کے معدوم ہو چکے، ہمیں کیچڑ اگلنے والے آتش فشاں مکران اور ضلع ژوب کی وادی گندار میں ملتے

ہیں، جو آج بھی اُبلتے رہتے ہیں۔ زلزلوں کی طرح یہ بھی ہمیں یہی یاد دلاتے ہیں کے بلوچستان ابھی تک "مطمئن" نہیں ہے۔ بنیادی قوتیں ابھی بھی یہاں سرگرم عمل ہیں اور عین ممکن ہے آگے چل کر یہاں کی سطح کا "انداز" خاصا تبدیل ہوجائے۔

موسم زدگی اور ارضی تسرف

اب ہم اپنی توجہ بلوچستان کی حیثیت کے تعین میں موسم زدگی اور ارضی تسرف کے کردار کی طرف مبذول کرتے ہیں۔ اگر یہ کہا جائے کے اس خطے کی معاشی، انسانی، اور مناظری قدریں دراصل موسم، پانی اور ہوائی قوتوں کا براہ راست نتیجہ ہیں تو مبالغہ نہ ہوگا۔ موسم زدگی نے حجری کمیتوں کو منتشر کر کے کھڑی چٹانوں کے وہ طبقات دئیے ہیں جن سے زیر زمیں آبی ذخیرے بن سکے اور جن کا پانی کاریز کے ذریعہ زیر استعمال آیا۔ ہوا نے باریک حجری اجزا کو وادیوں میں دوبارہ جمع کر کے ہمیں لوئس (LOESS) دے دی جن کے بغیر آج کی زرخیز و شاداب وادیاں بالکل ویران ہوتیں۔ آخری مگر اہم بات یہ ہے کے موسم، ہوا اور پانی سے بے حد و حساب تسرف نے جس سرزمین کو جنم دیا ہے اس نے یہاں کے باشندوں کی افتادِ ذہنی کو بھی بڑی حد تک متاثر کیا ہے اس لئے یہاں بلوچستان میں انسانی ذہن اپنے اردگرد کے قریبی مادی ماحول کا آئینہ ہے۔

بلوچستان میں ابھی تک انسان طفلِ فطرت ہے۔

موسم زدگی سے مراد سطح پر افتادہ حجری کمیت کے بکھرنے اور بے ترتیب ہونے سے ہے۔ اس طرح یہ مواد اس قابل ہوجاتا ہے کے پانی، برف یا ہوا انہیں منتقل کر سکے۔ "تسرف" موسم زدگی سے یوں واضح ہے کے اس عمل سے مراد "کتر دینا"، "کاٹ دینا" یا "تراش دینا" ہے۔ تسرف کا فطری اختتامیہ یہی ہے کے "اکھاڑے" ہوئے مواد کی دوبارہ انداخت ہوجاتے۔ اس کے لازمی معنی یہی ہیں کے ان کی منتقلی کا عمل بھی بروئے کار آتے۔ چنانچہ موسم زدگی، نقل وحمل، تسرف اور انداخت ایک ہی عمومی مظہر کے پیچیدہ طریقہ ہائے کار ہیں۔ بہر صورت ہم انہیں کسی حد تک علیحدہ علیحدہ زیر نظر لائیں گے تاکہ ان کے مجموعی ضبط و اثر کی قدر کر سکیں۔

موسم زدگی

موسم زدگی کے حلقۂ اثر کا اندازہ کرنے سے پہلے اس خطے کی آب وہوا اور متعلقہ پس منظر کو پیش نظر رکھنا لازمی ہوجاتا ہے۔ بلوچستان کے پہاڑ، اصولی طور پر، چونا پتھر، شیل، کانگلومیریٹ اور جنوبی مکران کی طرح سفید مٹی کے بنے ہوتے ہیں۔ چونا پتھر کا فصل چونکہ بہتر ہے اس لئے اس سے پانی بہ آسانی گذرتا ہے اور اس کی حل پذیری اعلیٰ درجے کی ہے۔ جہاں تک اجزائے فصل کا تعلق ہے، ان سے چونا پتھر کے خطے کی آبیات اور

ٹوپوگرافی عجوبہ اور امتیازی درجے کی ہوگئی ہے۔ عام سطح سے حجری ہباڈ زیادہ تر ان کے حل ہوجانے سے ہوتا ہے۔ درازیں بڑھ کر شگاف دار ہوجاتی ہے جبکہ استوانی "نالیاں" "منجلا بچوں" (small notches) یا منجلاب (small holi) غرض سب کے سب گھل مل جاتے ہیں۔
شیل اور دیگر مٹی کا چٹانوں کی "گلی جماعت" سے تعلق ہے۔ جس کا امتیاز عام نرمی ہے اور جس میں ضلعی مستوی نہیں ہوتی۔ ایسی چٹانیں کیمیائی موسم زدگی یا تسرف کی مزاحمت کرتی ہیں تا آنکہ استوائی آب و ہوا کی شدت سے کوئی مفر نہ ہو۔ لیکن میکانی عوامل سے بہ آسانی متاثر ہوجاتی ہیں۔ کانگلومیریٹ کھردرے ٹکڑوں کا ذخیرہ ہوتا ہے۔ ان میں طبقی علامتیں مدھم ہوتی ہیں اور ان کا فصل واضح نہیں ہوتا۔ موسم زدگی کے عمل کے خلاف ان کی مزاحمت کا انحصار اس باریک مواد کی سختی اور حل پذیری پر ہوتا ہے جو درمیانی جگہوں کو پُر کرتے ہیں نہ کے بڑے ٹکڑوں اور ان کی خصوصیات پر۔ اگر اولذکر کی مزاحمتی طاقت ادنیٰ ہوئی تو چٹان بہ آسانی ٹوٹ جاتی ہے۔ مختصر یہ کے حجری کمیتوں کی عمومی فنا پذیری بلوچستان کی خصوصیت ہے۔ جہاں تک موسم زدگی کا تعلق ہے، بلحاظِ آب و ہوا ہمیں صرف اتنا یاد رکھنا چاہیئے کے یہ حرارت کے "اعلیٰ یومیہ تفاوت" کی سرزمین ہے۔

حجری کمیتوں کی عمومی فنا پذیری اور حرارت کے اعلیٰ یومیہ تفاوت کا لازمی نتیجہ یہ نکلا کے یہ سارا خطہ ایک "ہیبت ناک تکسّر" کا شکار رہا ہے۔

ہر جگہ کا حجری انبار جو بنیادی طور پر منضبط تھا، بڑے بڑے بلاکوں میں کٹ کر، گول مول چٹانوں اور آڑی ترچھی جسامتوں میں ٹوٹ گیا ہے۔ حجری انباروں کی یہ مکمل "بربادی" جو حرارت کے حاد یومیہ تفاوت سے پیدا شدہ پھیلاؤ اور سکڑاؤ کے تواتر سے ہوئی ہے "پالے" کے عمل کی بھی ممنون ہے۔ اور یہ چند علاقوں مثلاً بالائی بلوچستان کے اونچے حصّوں میں سرگرم عمل ہے۔

انجام کار اس بڑے پیمانے کے تکسّر کے باعث کھڑی چٹانوں کے طبقات تشکیل پاتے، جو اس علاقے کی خصوصیات میں شامل ہیں۔ انہیں مقامی طور پر "پہاڑوں کا جھول" یا "دامن" کہا جاتا ہے۔ ان دامنوں کی معقول تفصیل کے لئے بہتر ہوگا کے مسٹر وریڈنبرگ کا حوالہ دیا جائے۔ وہ کہتے ہیں "کسی بڑے نظام نکاس کی غیر حاضری میں ان اندوختوں کا حجم خاصا ہو جاتا ہے اور دامن بلحاظ تناسب ان پہاڑوں کے ہم پلہ ہوجاتا ہے جن کے ملبے سے یہ خود مرتب ہیں۔ ان انباروں کی ڈھال اتنی کم ہے کے آنکھیں اس بلندی کو محسوس نہیں کر سکتیں جہاں یہ، پہاڑوں کی ڈھلوانوں پر، پہنچ جاتے ہیں (یا پہنچ چکے ہیں) اور اسی سے ان پہاڑوں کے ٹھگنے یا بونے نظر آنے کی وضاحت ہوتی ہے۔ باوجودیکہ ان پہاڑوں کی بلندی خاصی ہے"۔ غیر معمولی بارش مصدری کمیت سے گول مول چٹانیں توڑ کر یا ان کے ٹکڑے بہا کر میدانوں تک لے آتی ہے۔ اس طرح گول مول چٹانیں اور سنگریزے میدانوں کی سطح پر بکھر جاتے ہیں اور آخر کار بلوچستان کے

"دشت" بناتے ہیں۔ ان کا ذکر کرتے ہوئے وریڈنبرگ لکھتا ہے "ان سنگریزوں کی خارجی سطح لوہی۔ مرکب کی تکسید کی وجہ سے سیاہ ہے"۔ یہ مثال ہے کیمیائی موسم زدگی یا بے ترکیبی کی جو غیر معروف نہیں ہے۔ علاوہ ازیں حل شدہ معدنی مواد والے پانی کی تبخیر سے کیمیائی تاکل خصوصی طور پر بلوچستان کے مغربی ریگستانی حصے میں نظر آتا ہے۔

تسرف

دوسرے خشک خطوں کی طرح بلوچستان میں بھی تسرف کے عوامل بنیادی اور بااختیار ہیں۔ ان میں نباتات کی غیر موجودگی اور بارش سے زائد تبخیر شامل ہے۔ بلوچستان میں بارش کا   بمشکل ۱۰" ہے۔ نباتات نمایاں طور پر غیر موجود ہیں۔ لہٰذا فطری طور پر پانی کا تسرفی عمل سست پڑ جاتا ہے جب کہ ہوا کا یہی عمل تناسب میں زیادہ یا تیز ہو جاتا ہے۔

بلوچستان میں خاصیت کے لحاظ سے ہوا خشک ہے۔ بہاؤ کے لحاظ سے مستقلاً تیز جیسا کے "گوریچ" یا شمال مغربی ہوا۔ یہ ہوائیں کوارٹز کے ذرات سے "مسلح" ہوتی ہیں جو یہاں کی ریت کا غالب معدنی جزو ہے۔ کوارٹز (کے ذرات) سے بھری یہ ہوائیں، چونا پتھر، شیل کانگلومیریٹ وغیرہ جن سے بلوچستان بنا ہے، ٹکرا کر اعلیٰ تسرفی عمل جاری رکھتی ہیں۔ اس عمل کے نتیجے میں بے شمار خط و خال ابھرتے ہیں جو خصوصیات میں "سمارونگی"

شکلوں، زیوگین، یارڈانگ، دریچوں اور زمین کے چھوٹے کھوکھلے حصوں سے مشابہ ہوتے ہیں۔

کوہِ سلطان کے ان پہلوؤں کا جو تسرف سے متعلق ہیں پہلے ہی حوالہ دیا جا چکا ہے۔ یہاں یہ بات قابلِ غور ہے کے اس کی بنیادی چوٹیوں میں ایک تسرف سے اس قدر متاثر ہوئی ہے کے ابوالہول (Sphinx) سے مشابہ ہو گئی ہے۔ "گوریچ" کے علاوہ موسمِ گرما کے دوران حراری کیفیت کے باعث گرم لہریں اٹھتی ہیں، اور بعد میں بگولوں کی شکل اختیار کر لیتی ہیں۔ اس طرح ہوا کا عمل تسرف معمول سے زیادہ تیز ہو جاتا ہے۔ یہ بگولے یوں تو بلوچستان میں عام ہیں لیکن مغربی اور جنوبی حصوں میں ان کا تو اتر اور ان کی تباہ کاری زیادہ ہے۔ مغربی حصے کے ان بگولوں کا ذکر کرتے ہوئے سر ہنری میکموہن کہتے ہیں "اڑتی ہوئی ریت سے زمین و آسمان ایک ہو جاتے ہیں۔ اگر ایسے میں کوئی اپنی جگہ سے دو چار گز بھی بڑھنے کی کوشش کرے تو یہ بری طرح پیش آتی ہے"۔ پانچ منٹوں میں یہ بگولے بلٹنوں کے بنائے ہوئے راستوں (نشانات) کو بگاڑ دیتے ہیں بگولوں کی جمع کردہ ریت سے سطح کی بنیادی حالتوں میں جو نظارہ خیز تبدیلیاں ہو جاتی ہیں ان کا کسی حد تک اندازہ چاغی پہاڑوں کے بارے میں درج ذیل تفصیل سے ہوتا ہے۔ میکموہن لکھتا ہے "ریت ان سب پہاڑوں پر نبٹا ریچ چھائی جا رہی ہے۔ گویا یہ ریت میں دفن ہوتے جا رہے ہیں

جو ان کے دونوں جانب بڑی بے رحمی سے اوپر رینگتی جا رہی ہے کئی پہاڑ تو ایسے ہیں جو مکمل طور پر دفن ہو چکے ہیں۔ ان کی جائے تدفین کی نشاندہی ریت کے ایک اونچے پہاڑ سے ہوتی ہے۔ کچھ ایسے ہیں جن کی سیاہ چوٹی سفید ریتیلی ڈھلوانوں کے اوپر نظر آتی ہے۔ کہیں کہیں کوئی بہت اونچا (ریت کا) انبار اپنے گرد نگل جانے والے ویرانوں کے درمیان آج بھی سیاہ ٹیلوں کے ساتھ سب سے نمایاں ہے، لیکن ان کے گرد پھیلی ہوئی ریت جو ان کے قاعدوں سے ہزار دو ہزار فٹ اونچائی تک پہنچ چکی ہے، یہی پیش گوئی کرتی ہے کہ ان کا بھی وہی حشر ہونے والا ہے۔"

مندرجہ بالا اور ریت کے ٹیلوں کا ایک دوسرے سے گہرا تعلق ہے۔ چارلس میلگریگر نے اپنی کتاب "بلوچستان میں آوارہ گردی" میں بڑی تفصیل کے ساتھ ریت کے ان ٹیلوں کا ذکر کیا ہے۔ "ان سب کی شکل ایک جیسی ہے اور یہ سب صورتاً ہلالی ہیں۔ ان کے باریک حصوں کا رخ جنوب کی جانب ہے اور ان کے چوڑے حصے (انگشتے) شمال کی سمت۔ بلندی کے لحاظ سے ان میں بڑا فرق ہے۔ جو ان میں سب سے بڑا ہے وہ اپنے اردگرد کے لحاظ سے ۶۰ فٹ اونچا ہے اور اپنی دونوں نوک کی سمت میں بتدریج ڈھلوان ہے، جو اردگرد کی ریت میں ضم ہو جاتی ہے۔ خارجی ڈھلان ۳۰ درجہ کے زاویہ پر ہے۔ وسطی حصے میں تھوڑا سا

ابھار ہے اور اندرونی ڈھلان ۴۵ درجہ پر یا اس حد تک کھڑی ڈھلان کے ریت ٹک سکے۔ خارجی ڈھلان کے بالائی اور ٹیلے کے نچلے حصے میں سب سے زیادہ کھڑی ڈھلان ۳ فٹ ہوتی ہے جو بتدریج نوک تک پہنچ کر غائب ہو جاتی ہے جہاں ساری خارجی ڈھلان یکساں ہوتی ہے۔"

ریت کے یہ ہلالی ٹیلے 'بدرجہ فضیلت'، وہی بارکھان ہیں جن کے بارے میں ہم طبعی جغرافیہ کی کتابوں میں پڑھتے آئے ہیں۔ بلوچستان کے ضلع لورالائی کی ایک تحصیل کا نام بھی بارکھان ہے۔ یہ غیر ممکن نہیں کہ اس تحصیل کا نام رکھنے میں وہ علامتی تعلق پیشِ نظر ہو جو مغرب میں واقع ریگستانوں کے ان ہلالی ٹیلوں سے ہے۔ کیونکہ یہی ٹیلے اس علاقے کا امتیازی اور سب سے زیادہ متاثر کن خط و خال ہیں۔

اعلیٰ درجہ کا میکانی تاکلُّ، زبردست بگولے، ریت کے ٹیلے اور بارکھان غرض یہی سب ہوا کی وہ کامیابیاں ہیں جو بلوچستان کی ہیئتی حیثیت کو نکھارنے میں اسے حاصل ہوتیں۔ ان میں ہم ایک اضافہ کر سکتے ہیں۔ یہاں کی وادیاں زیادہ تر لوئس سے مرتب ہیں۔ اور جیسا کہ ہم جانتے ہیں ان کی تشکیل اڑا کر لائی ہوئی خاک پر مبنی ہے۔ یہاں تک کہ میدانوں میں بھی سیلابی مٹی اور لوئس ملی جلی ہے۔ ایک ایسی سرزمین جو خالصتاً چونا، پتھر، شیل، مٹی، ریت اور سنگریزوں سے مرتب ہو وہاں لوئس جیسی زرخیز مٹی کی اہمیت کو کم نہیں کیا جا سکتا۔

ہوا کے علاوہ بلوچستان کی ہیئتی حیثیت کو پانی بھی متاثر کر گیا ہے سطح پر نباتات کی غیر موجودگی کے باعث اور چونا پتھر کے فصل (جوڑوں) کی رہنمائی میں بلا روک ٹوک گذر کر بارش نے پہاڑوں کے دونوں جانب بے شمار "گلیاں" بنا دی ہیں۔ اور دیگر کئی مقامات پر، اس علاقے کی کندہ کاری کر کے اسے "بد زمین" (Bad-Land) بنا دیا ہے۔ ہم پہلے ہی ان پتھریلے میدانوں یا "دشت" کا ذکر کر چکے ہیں جو سنگریزوں سے ترتیب پاتے ہیں۔ ان سنگریزوں کو حجری ملبوں سے سیلاب نے منتقل کیا اور بعد میں ان کی تہ نشینی ہوئی۔ بلوچستان میں، اچانک آنے والے، اور زوردار سیلاب غیر معمولی نہیں۔ لیکن تضاد یہ ہے کہ اس خطے میں سیلاب کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ "اس سرزمین کی سطحی ترکیب سیلاب سے بڑے نقصانات کو ناممکن بنا دیتی ہے۔" دراصل مسئلہ ان تیز رفتار پہاڑی نالوں کا ہے جو مقامی اور مقابلتاً کم بارش کے بعد فوراً ہی ابل پڑتے ہیں۔ بلوچستان میں تھوڑی سی بارش کے بعد ہی یہ نالے، جو مختصر مدت کے لئے رواں ہوتے ہیں، یہاں کی زمین اور یہاں کے لوگوں کے لئے تباہ کن بن جاتے ہیں۔ ماضی میں ان نالوں نے کئی پہاڑیوں کو کاٹ کر گہری اور تنگ گھاٹیاں بنا دی ہیں۔ جو ہر سال دریا کی نیچی ہوتی ہوئی سطح کے ساتھ کچھ اور گہری ہوتی جاتی ہے۔ ان گھاٹیوں یا دروں میں بعض تو خوفناک حد تک گہری ہو چکی ہیں۔ مثلاً کوہِ سلیمان میں واقع

زاؤ اور گاٹ کی گھاٹیاں جو تقریباً ۲۰۰۰ فٹ گہری ہیں، اور کئی مقامات پر صرف چند گز چوڑی ہیں۔ سر ہنری میکموہن کے یادگار الفاظ کے مطابق "ان چند گھاٹیوں سے بہتر کوئی تصور تو محال ہے۔"

عام طور پر یہی کہا جائے گا کہ ان گھاٹیوں یا دروں کی بدولت یہاں کی وادیوں کے مابین اور ان سے باہر کی دنیا کے درمیان سلسلۂ مواصلات قائم ہو سکا۔ ان میں سے چند پہاڑی دروں کی حیثیت سے مثالی بن چکے ہیں جیسے بولان یا مولا نام کے درے۔ جن سے سکندر اعظم کی فوج کا ایک حصہ کریٹروس کی سربراہی میں ۳۲۵ سال قبل مسیح وادیٔ سندھ سے واپس جاتے ہوئے گذرا تھا۔

پانی کا عملِ تسرف صرف سطح تک محدود نہیں ہے۔ بلکہ زیر سطح پہنچ کر مساوی اہمیت کے خط و خال ابھارتا ہے۔ جو معاشی نقطۂ نظر سے شاید زیادہ ہی اہم ہیں۔ چونا پتھر کی خصوصی صفات کا ذکر پہلے ہی کیا جا چکا ہے۔ لیکن اس کی اہمیت کے اظہار کے لئے یہاں یہ بات بطور ذکر ثانی کہی جا سکتی ہے کہ چونا پتھر کی سب سے نمایاں خصوصیت بارش کے پانی میں اس کی حل پذیری ہے جو اس کے نظامِ فصل کی بدولت زیادہ ہو جاتی ہے۔ لہٰذا فطری طور پر بلوچستان میں پانی کے لئے یہ امر آسان ہے اور زیر سطح اس کے از خود نفوذ نے کئی عجوبے تشکیل دئے ہیں۔ اس کا نتیجہ جو ظاہر ہوا ہے وہ یہ ہے کہ ایک دریا معمولات کے

مطابق ظہور پذیر ہوتا ہے، سطح پر کچھ دور تک رواں رہنے کے بعد اچانک زیر زمیں چلا جاتا ہے اور اپنے راستے سے نیچے کسی سطح پر دوبارہ نمودار ہوتا ہے۔ یہ آنکھ مچولی اس سرزمین کی آبیاتی خصوصیت ہے اور جس کا کم از کم جزوی نتیجہ یہ ہے کہ بلوچستان میں خشک وادیوں اور خشک ندیوں کی تعداد زیادہ ہے۔ کھڑی چٹانوں کے طبقات میں اس زیر زمیں پانی کے رساؤ سے کاریزوں کے لئے ذخیرے مہیا ہوتے ہیں اور موافق حجری ترکیب نے چشموں کا سامان کر دیا ہے۔ جو اپنے تئیں انسانی آبادکاری اور معاشی سرگرمیوں کے ماسکے بن چکے ہیں۔ اسی سے متعلق خط و خال کا ایک اور جزو "فواری کنواں" ہے جس نے بلوچستان کے کوئٹہ۔ پشن اضلاع میں خاص عملی حیثیت حاصل کر لی ہے۔ کسی ایسے کنویں کی دریافت بلوچستان کے لئے کوئی نئی بات نہیں۔ کوئٹہ شہر اور تحصیل میں کئی ایسے کنویں موجود ہیں جن کے بارے میں ۱۹۰۳ء کے آبپاشی کمیشن نے نشاندہی کی تھی کہ "برصغیر کے دیگر علاقوں کے بجائے بلوچستان میں اس بات کی اُمید زیادہ ہے کہ زیر زمین پانی اوسط گہرائی پر حاصل کیا جا سکے گا۔" اصل مقصد جس کی دریافت قدرے تاخیر سے ہوئی وہ یہ ہے کہ اس سرزمین میں فطرت کے ان مخفی سرچشموں اور علامتی طور پر دیگر تمام قدرتی وسائل کی چھان بین اور ان کی مہم کاری کی جائے۔ اس طرح اس سرزمین اور اس کے باشندوں کی معاشی بہتری کا تحفظ کیا جا سکتا ہے، اور ترقیات

کو مطلوبہ حد تک لایا جا سکتا ہے۔ اس کے لئے یہ امر ناگزیر ہے کہ ہمارا انحصار جغرافیہ اور ارضیات کے تو امی مضامین پر ہو۔

آخری بات

اب تک ہم نے زمین کی ان بنیادی قوتوں کا مختصر جائزہ پیش کیا ہے جنہوں نے بلوچستان کو ایک خطے کی شکل دی ہے اور اسے پاکستان کے دیگر خطوں سے جدا اور واضح کر دیا ہے۔

ٹیتھس کے فرش سے پیدا شدہ، کوہ زا قوتوں کے زیر اثر خمیدہ اور خطا زدہ، متواتر زلزلوں سے شکستہ اور آتش فشانوں سے ایذا رسیدہ بلوچستان بڑے انتشار سے گذرا ہے اور اب بھی مستقلاً انتشاری قوتوں سے دوچار ہے جس کے نتیجے میں ہوا اور پانی کی قوتوں کے لئے ایک تر لوالہ بن گیا ہے۔

٭٭٭

حصّۂ منظومات

کوئٹہ کے حسین نظارے

دور پچھم میں ڈوبتا سورج،
سرِ کہسار کچھ شفق پارے!
سبز وادی میں کچھ شگفتہ گلاب،
جیسے مخمل پہ سُرخ انگارے!
بادِ صرصر کے اِک اشارے پر
آنکھیں ملتے ہوئے اُٹھے تارے!
نغمہ و نور کی ہوئی بارش،
مستیوں کے اُبل پڑے دھارے!

کتنے رنگیں، مگر اُداس اُداس!!
کوئٹے کے حسین نظارے

(کوئٹہ ۱۹۴۷ء)

پس منظر

یہ لٹن روڈ، یہ سر سبز چناروں کی قطار!
جیسے دو رویہ صف آرا ہوں عروسانِ بہار!
دور چلتن سے پرے، ڈوب رہا ہے سورج
تیرتی پھرتی ہے وادی میں سنہری جھنکار
تازہ پھولوں کے چھلکتے ہوئے پیمانوں سے
فرش گلکار اِدھر، عرش اُدھر ہے گلکار
پھول تو پھول ہیں، کانٹے بھی ہیں رنگیں اے دوست
سنگ ریزوں میں مچل اٹھتی ہے موجِ انوار

یہ تو منظر ہے مگر اے مرے ہمدم، مرے دوست!
تُو نے پامالیِ فطرت کو بھی دیکھا ہوتا
میں تو جب کہتا کہ ہاں، موسمِ گُل آیا ہے
جب پہاڑوں پہ بھی اس بات کا چرچا ہوتا
جب چٹانوں کا جگر توڑ کے بہتا پانی
آبشاروں کا لہکتا ہوا نغمہ ہوتا
"میوہ بازار" کی سڑکوں پہ وہ سونے والا
میوہ زاروں کی گھنی چھاؤں میں سویا ہوتا

ان چناروں کے حسیں سائے میں اکثر مجھ کو
ایک کُملایا ہوا پھول نظر آیا ہے
پھول! تخلیق کا شہکار! وہ بنتِ کہسار
جس کے جذبات کو قانون نے ٹھکرایا ہے
وہ بہاروں میں بھی پامال ہی رہنے والی
وادیِ شال کی رعنائی کا سرمایہ ہے
کتنے ہی پھول نگاہوں سے نہاں ہیں ایسے
جن پہ ایجادِ زمانہ نے ستم ڈھایا ہے

یہ ہوائیں، یہ فضائیں، یہ چناروں کی قطار!
جیسے دو رویہ صف آرا ہوں عروسانِ بہار
یہ تو منظر ہے مگر دیکھ کہ پس منظر میں
جیسے شرمندہ ہے اس موسمِ گُل کا فنکار!!

(کوئٹہ ۱۹۴۹ء)

برفباری سے پہلے

اگرچہ اب بھی چمن میں بھرے ہوئے ہیں سُبو
رُکا رُکا سا ہے فطرت کا اہتمامِ نمو

ٹھمک ٹھمک کے وہ شاخوں سے پھوٹنے والو!
مرے شریر شگوفو! کرو بھی فکرِ رفو
کہ اب نسیمِ سحر کا بدل رہا ہے چلن
مُکر رہا ہے تمہیں سے تمہارا یہ گلشن

چنار و سرو سمن پر ہے حُزن یوں طاری
بھرے شباب میں جیسے عروسِ نو پہ تھکن
قضا ہو جیسے چھپی زندگی کے پردے میں!

مرے حسین گلو! اب تمہارے شیشے میں
نظر فروزیٔ شبنم کا دور ختم ہوا
تمہارے خندۂ پیہم کا دور ختم ہوا
پناہ گاہوں میں سہمے ہوئے بسے ہیں آہو
کہ ایک نیند اچانک انہیں سلا دے گی
چھنک پڑیں گے فضائیں جو برف کے گھنگرو

(کوئٹہ ۱۹۵۲ء)

آئینے میں غلطاں غلطاں

صبح سویرے اٹھ کر جیسے کوئی چھڑائے مانگ کی افشاں،
شاداں، شاداں
ہنس ہنس جیسے کوئی دکھلائے اور چھپائے جلوۂ تاباں،
نازاں، نازاں
بزم میں جیسے ساقیٔ مہ وش سیمیں ساغر چھلکائے
تجلی چمکائے
صہبا برسے، مستی اُمڈے، اُمڈے اِک ایسا طوفاں
میخانہ بہہ جائے

دیکھ رہا ہوں چپکے چپکے — جھلمل جھلمل نظارے
عرش سے گرتے اُجلے اُجلے — رِم جھم رِم جھم مہ پارے
بوجھ سے جن کے کہساروں کے — شانے بھی تھک ہارے
عریاں عریاں شاخوں پر ہے سحر کسی کا سلسلہ جنباں
پیہم رقصاں
آئینے میں غلطاں غلطاں
آئینوں میں اُمڈا اُمڈا — جلوہ فطرت!
چار طرف ہے لہرایا سا — نغمۂ رحمت!
جیسے یزداں
چھیڑ رہا ہے ساز مستاں
ٹھہر ٹھہر اک تسلسل، سلجھا سلجھا خواب پریشاں!
دیدۂ و دل ہیں حیراں حیراں!!

خزاں سوز

شال کی وادیِ زرپاش میں مت آنے دو
چار ہی دن تو ہوئے ہیں کہ کِھلا ہے یہ چمن
چار ہی دن تو ہوئے ہیں کہ یہ پھولوں کے چراغ
شدّتِ گریۂ شبنم سے ہوئے ہیں روشن!

آج لیکن وہی منحوس، وہی سرد ہوا
اِن چراغوں کو بجھا دینے پر آمادہ ہے
آج پھر اے مرے فردوس! ترے دَر کے قریب
کُہر اک تیغ سنبھالے ہوئے استادہ ہے!

اِن فلک بوس پہاڑوں پہ بھروسہ نہ کرو
کُہر اور یخ کی جفاؤں کے مددگار ہیں یہ
راہ دے دیں گے، وہ درّانہ چلی آئیں گی
سرد و بے رحم ہواؤں کے وفادار ہیں یہ!!

مرے نوخیز گلو! تم ہی سنبھل کر رہنا
اس چمن زار کی تقدیسِ نمو تم سے ہے
کونپلو! بھول نہ جانا کہ ازل سے اب تک
میری رگ رگ میں رواں گرم لہو تم سے ہے

عصمتِ جذبۂ ہستی کی سپر بن جانا!
میری سوگند! اے خزاں سوز شرر بن جانا!

(کوئٹہ ۱۹۵۳ء)

نغمۂ صحرا

ساربان! اے ساربان!
اے امیرِ کارواں!
پاسبانِ آرزو!
زندگی کے، ترجماں!
زندگی کے ترجماں، تیز لے چل کارواں!
ساربان! اے ساربان!

دیکھ تارے کھِل گئے!
کھِل کے باہم مل گئے!
بن گئی راہِ سفر!
جگمگاتی کہکشاں!
جگمگاتی کہکشاں ہے تیز لے چل کارواں!
ساربان! اے ساربان!

دشت ہو یا کوہسار!
ہو بلا سے خار زار!
تیرا ہر نقشِ قدم
بوستاں در بوستاں
بوستاں در بوستاں، تیز لے چل کارواں!
ساربان! اے ساربان!

ہاں! ہمیں معلوم ہے
یہ حضر مذموم ہے
جو رکا وہ رہ گیا
جو بڑھا وہ شادماں!
جو بڑھا وہ شادماں، تیز لے چل کارواں!
ساربان! اے ساربان!

ہے یہی آنِ وجود
نوبہ نو شانِ وجود
نوبہ نو کہتے رہیں
کُن فکاں کی داستاں!

کُن فکاں کی داستاں، تیز لے چل کارواں!
ساربان! اے ساربان!

کُن اعطائے لم یزل!
کن ہے کیا عزم و عمل!
جذبۂ تسخیر ہے
کُن کی تفسیرِ نہاں!

کن کی تفسیرِ نہاں! آج ہم پر ہے عیاں
تیز لے چل کارواں! تیز لے چل کارواں!

(دکوٹہ سنہ ۱۹۵۳ء)

ذوقِ نمو

ہے رنگ فضا کا دلبرانہ
آیا ہے خمار کا زمانہ
شبنم نے ربابِ گُل پر
چھیڑا ہے بہار کا ترانہ

گلشن میں مچی ہوئی ہے ہلچل
ہر شاخ سے پھوٹتی ہے کونپل
کانٹوں پہ نکھار آرہا ہے
کلیوں کا سرک رہا ہے آنچل

سُنبل نے اٹھا لیا ہے شانہ
نرگس کی نظر ہے عارفانہ
سوسن کا تو ذکر ہی نہ کیجیے
ہر بات ہے اس کی اک فسانہ

اِک حشرِ نمو ہے آج برپا
انگڑائیاں لے رہا ہے سبزہ
صف بستہ چنار جھومتا ہے
وادی ہے تمام ایک نغمہ

دریا میں حباب تیرتا ہے
صحرا کو بھی وجد آگیا ہے
اللہ رے ذوقِ خود نمائی
ذرہ بھی گہر بنا ہوا ہے

"کاریز" کا سیم پاش پانی
یہ اس کی چھپی چھپی روانی
کہسار کے دل کی آرزو ہے
ہے جذبِ دروں کی اک کہانی

یہ موسمِ گُل، یہ اس کے جلوے
جلوے یہ تمام ہیں خودی کے
اے وادیٔ شال! تیرے قرباں
ہم کو بھی یہ بانکپن سکھا دے

ہم کو بھی یہ رنگ و بو عطا کر
یہ منزلِ آرزو عطا کر
اس میکدۂ زمردیں سے
صدقے ترے! اِک سبو عطا کر

(کوئٹہ ۱۹۵۱ء)

عینِ مقامِ شوق میں!

موجۂ بحرِ بے قرار — لالۂ دشت داغدار
رنگ کلی کا زرد زرد — پیرہن اس کا تار تار
شبنم غنچہ آفریں — شدتِ غم سے اشکبار
نرگس و نسترن خموش — ساکت و دم بخود چنار
مہر بہ لب ہے عندلیب — جیسے کوئی گناہگار

خلوتِ شب میں ہے نڈھال — موسمِ گل کا ماہتاب!
اخترِ صبح، مضمحل — صبح، حدیثِ اضطراب!
شام ہے داستانِ غم — رات کو پھر وہی عذاب

تم تو ثواب کار ہو — نغمۂ کیف بار ہو!
وقت کے لاڈلے ہو تم — وقت کے رازدار ہو!

تم ہی بتاؤ کیوں بھلا — رنگ کلی کا اُڑ گیا
سبزۂ دنگ ہیں کیوں خموش — سرو سمن کو کیا ہوا
بادِ سحر کے بھیس میں — کون ہے یہ چھپا چھپا

کچھ تو جواب دو مجھے — آج یہ کیا ہے ماجرا
عینِ مقامِ شوق میں — شوق کا کارواں لٹا

"زمانہ" کوئٹہ — (کوئٹہ ۱۹۵۰ء)

سانیٹ

●

نکہت و نور کی پروردہ یہ متوالی شام
جنبشِ موجِ صبا، جیسے لچکتی کونپل
ذرے ذرے کو بناتی ہوئی اک تاج محل
گوشے گوشے میں لنڈھاتی ہوئی جامِ گلفام
آج ہر گام پہ کرتی ہے مجھے جُھک کے سلام
آج ہر چیز نظر آتی ہے کھائی ہوئی بَل
میرے سینے میں قیامت کی مچی ہے ہلچل
بدلا بدلا سا نظر آتا ہے عالم کا نظام

جیسے ہر چیز مجھے دیکھ کے ہنس دیتی ہے
انجستاں سے کوئی جھانک کے رہ جاتا ہے
جُھک کے کہسار سے کچھ کان میں کہہ جاتا ہے
جنبشِ موجِ صبا جسم کو ڈس لیتی ہے

دل پہ گمنام سا اِک بوجھ ہے گھبراتا ہوں!
آج میں اپنے تبسم سے ہی کتراتا ہوں!

(کوئٹہ ۱۹۴۵ء)

(۲)

ہلالِ عید کو میرا سلام کہئے گا
مرا سلام جو ہے پھول سے بھی نازک تر
مچل رہا ہے جو میرے لبوں پہ آ آ کر
مری جناب! مرا وہ پیام کہئے گا!
نظر جھکا کے بہ صد احترام کہئے گا!
یہ پوچھئے گا تجھے دیکھ کر کسی کی نظر
چھلک چھلک کے لٹاتی ہے آج کیوں گوہر؟
دُکھی دُکھی سی ہے کیوں، اس کی شام؟ کہئے گا!

ہلالِ عید اگر آپ کو جواب نہ دے
تو دیکھئے کہ خدارا یہ راز فاش نہ ہو!
یہ آپ کا ہی تبسم سہی، صدا چھلکے!
خدا کرے یہ مرے دل کی کوئی قاش نہ ہو!
زمانہ، آپ کا عکسِ جمالِ رُخ سمجھے!
ہلال میری اُمیدوں کی ایک لاش نہ ہو!

(کوئٹہ ۱۹۴۹ء)

(۳)

کلی کا روپ، گلوں کا نکھار لائی ہو
شفق سے رنگ، گھٹا سے چرا کے حُسنِ خرام
ہر ایک گام پہ چھلکا رہی ہو ناز کے جام
قدم قدم پہ ہجومِ خمار لائی ہو
کہاں کہاں سے یہ سولہ سنگار لائی ہو
تمہارا سحر جنونِ خیز بھی ہے سحر تمام
نظر نظر ہے سکونِ حیات کا پیغام
دیارِ شوق میں جوشِ بہار لائی ہو

مری نگار! مگر یہ دیارِ شوق ابھی
بہارِ زیست کی رعنائی سے ہے بیگانہ
ابھی تو گرم بگولوں کا رقص ہے جاری
تمہیں بتاؤ، میں کیسے اٹھالوں پیمانہ!
جو ہو سکے تو، لبوں کی نچوڑ دو سرخی
لکھوں گا اس سے غمِ آرزو کا افسانہ

(ادبِ لطیف) (کوئٹہ ۱۹۴۹ء)

۶

مثالِ شمعِ محفل ہر طرف تم ضوفشاں ہو گے
ہمکتے ہو گے تم رہ رہ کے یوں آغوشِ مادر میں
ہو، موتی جیسے اک بحرِ عرب کی موجِ مضطر میں
تم اپنی کوششِ گفتار میں کچھ نغمہ خواں ہو گے
نہیں تو چین سے خوابیدہ مثلِ گلستاں ہو گے!
مگر "شوکی" وہ اک غنچہ جو تھا شاخِ صنوبر میں
وہی آنگن میں اک جانب، تمہارے اپنے اس گھر میں
اسی غنچہ نے پوچھا ہے کہ تم کب تک جواں ہو گے!

جواں ہو کر تم اپنے ہاتھ میں کب لو گے دل میرا
مرے دل کو تم اپنے ہاتھ سے کب تک کھلاؤ گے؟
ملاؤ گے مری نکہت میں تم کب تک نفس اپنا
نفس سے اپنے تم سارے گلستاں کو بساؤ گے؟

یہ نیلا آسماں تکنے لگا ہے راستہ کس کا؟
تم اپنے راستے پر آسماں کو کب جھکاؤ گے!

(کوئٹہ ۱۹۵۱ء)

۵

اُفق پر آج پھر جھلکی ہے یزداں کی جبیں ساقی!
سمٹ آیا ہے آنکھوں میں، فروغِ جلوۂ ایمن
اٹھا مینا سبو بھر دے، بڑھا دے دل کی پھر دھڑکن
مگر پہلے بتا دے ستم ہے یا ہے انگبیں ساقی!
اگر یہ انگبیں ہے تو نہیں ساقی! نہیں ساقی!
کہ انجامِ تمنا سے یہ نکتہ ہو گیا روشن
محافظ ہے تمنّا کا جنوں، ہے یہ خرد رہزن!
خرد کا آ گیا ہے آج روزِ آخریں ساقی!

خدا حافظ، کہ ہے میرا خرد خود مجھ سے شرمندہ
نہیں تو اس مئے رنگیں میں ایسی کون سی شے تھی؟
اگر یہ معصیت ہے تو، تری رحمت ہے پائندہ
ہے تجھ سے آج لیکن التجا یہ آخری اپنی
غزالہ پوچھنے آئے تو کہنا ہاں! وہ ہے زندہ
خدا پوچھے تو کہہ دینا، ضحیٰ نے خودکشی کر لی!

(کوئٹہ ۱۹۵۳ء)

[redacted]

۸

وہی عارض، وہی آنکھیں، وہی گیسوئے دراز!
لہلہاتا ہوا، امڈا ہوا، معصوم بدن!
شیشۂ لب میں وہی ایک چھلکتا سا گداز
دائروں کا وہی نکھرا ہوا، نورس گلشن!

آج تم پہلے پہل بزم میں آتی ہو نظر
سوچتا ہوں کہ، یہ تم ہو کہ ہے ماضی میرا!؟
زخم کہنہ ہو کہ ہو ایک نیا زخم جگر!؟
آج اے کاش! یہاں میں ہی نہ آیا ہوتا!!

ڈوبتے دل کو یہ کمیاب سنبھالا ہی سہی
اس سنبھالے کا یہ احسان!؟ نہیں رہنے دو ابھی [redacted]
اجنبی تم نہ سہی، میری غزالہ ہی سہی
تم سے پھر آج یہ پیماں؟؟ نہیں رہنے دو ابھی!

یہ غم دل تو ازل ہی سے اِک عنواں ہے مرا
غم گیتی، غم انساں سے بھی پیماں ہے مرا

(کوئٹہ ۵۳ء)

[redacted]

۹

بے باک دعاؤں کا اثر لے کے چلے تھے
ہونٹوں پہ دمکتا ہوا مخمور تبسّم
شیرینیٔ آہنگ سے معمور تکلم
دامانِ تمنا میں گہر لے کے چلے تھے
ہر گام تجلّیٔ قمر لے کے چلے تھے
کونین یم عزم کی پنہائی میں تھے گُم
کس درجہ پشیماں تھا اندھیرے کا تلاطم
اس رات کے ہم اپنی سحر لے کے چلے تھے!!

ہم تو یہی سمجھے تھے کہ گلریز ہیں جادے
ہر سانس میں منزل کے سکوں خیز نشاں ہیں
تخلیق سحر پر میرے پندار کے نغمے
لمحات کے آغوش میں ہم رنگِ فغاں ہیں
دو اتنی اجازت تو میں پوچھوں یہ تمہیں سے
تم کون ہو؟ میں کون ہوں؟ ہم لوگ کہاں ہیں؟

(ادب لطیف)

(کوئٹہ ۵۴ء)

۱۰

ظلمتوں نے پھر بچھا رکھا ہے جال!
جال میں جکڑے گئے ہیں پھر نجوم
خندہ زن بادِ صبا پر ہے سموم
ہے یہی کیا آرزوؤں کا مآل ؟؟
دیکھ لے جی بھر کے اے چشمِ خیال!
یہ بگولوں کا چمن میں ہیر پھیر
نیم وا غنچوں کی لاشوں کا یہ ڈھیر
اے خدا! میرے خدائے ذوالجلال!!

میں تو پابندِ سلاسل ہوں مگر
مُہر بر لب دیکھتا کب تک رہوں!
بہہ چکا ہے شہ رگوں کا کتنا خون!
لُٹ رہا ہے اب بھی آنکھوں کا گہر

کیا چلا جائے گا سب کچھ رائگاں!؟
ختم کب ہو گی یہ پیکارِ خزاں!؟

(ادبِ لطیف) (کوئٹہ ۵۴ء)

بولان بک کارپوریشن

* معیاری، دیدہ زیب اور قومی ادب کی اشاعت کرتا ہے،
* اس کی ہر اشاعت قومی و بین الاقوامی ادب میں ایک بیش بہار اضافہ ہوتی ہے۔

ہماری مطبوعات

بلوچستان سالنامہ	سید فصیح اقبال	۲۵-۰۰
گائیڈ جابلوچستان	کامل القادری	۵-۰۰
قدیم بلوچستان	کامل القادری	۵-۰۰
بلوچی زهگ بلد	عبدالقیوم بلوچ	۵-۰۰
بلوچی بومیا (نیا ایڈیشن)	عبدالقیوم بلوچ	۱۵-۰۰
گل زمین (شعری مجموعہ)	کامل القادری	۳-۰۰
براهوئی پیرایہ بیان	کامل القادری	۳-۰۰

بچوں کے لئے

بولان کا خزانہ (ناول)	کامل القادری	۳-۰۰
اکڑو خان (منظوم کہانی)	رئیس فروغ	۰-۷۵
سٹر گشت (نظمیں)	قمر ہاشمی	۲-۵۰

بولان بک کارپوریشن

* جناح روڈ، کوئٹہ
* سعید چیمبرز، پہلی چورنگی، ناظم آباد، کراچی

PAKISTAN GEOGRAPHICAL REVIEW

(Formerly Panjab Geographical Review)

1950

VOL. V

NO. 2

EDITORIAL BOARD

KAZI S. AHMAD	...	*Chairman*
E. T. DEAN	...	*Editor*
A. HAYE	..	*Associate Editor*
Mrs. R. M. DURRANI	...	,, ,,
K. U. KUREISHY	...	,, ,,
Miss MARYAM, K. E.	...	,, ,,
FAZLUR RAHMAN	...	*Joint Editor*
K. U. KUREISHY	...	*Manager*

*All comnumicatiolls to "e ad4ressed to the Mtlnager, Pakistan **Geographical Review,***
*Department of Geography, University of the Panjab, Lalio« e **(Pakistan)**.*

CONTENTS

Page

1, The Physi0graphical personality of Baluchistan *by* S. 2oha, M.A. (Alig.); Lecturer.in-Geography; Government College; Quetta ... 1

2. The Role of Geography in our National Planning *by* Dr. Kazi Said-ud-Din Ahmad, M.A., LL.B., Ph.D. (London), Head of the Department of Geography, University of the Panjab, Lahore ... 16

3. The Comparative Agricultural Geography of Barbary (French North Africa) and the Punjab (P) with special reference to their Common Problems *by* Maqbool Ahmad Bhatty, M.A., Ph.D. (Edin). ... 2~

4. The Discovery of Dina *by* Fazlur Rahman, Deptt. of Geography, Lahore 40

THE PHYSIOGRAPHICAL PERSONALITY OF BALUCHIST AN

BY

S. ZOHA, M.A. (AUG.); LECTURER IN GEOGRAPHY
GOVERNMENT COLLEGE; QUETTA

1. Introduction

INUnited India certain parts of the Sub-continent had suffered a great deal of political, economic and other negligences. Among those B<11uchistan had suffered most. It was partly due to its great distance from the then capital of the country partly to the mountainous nature of the land and the so-called "hostile" attitude of the inhabitants towards an alien Government. The Afghan 'vVars in 1839, and 1878, proved the strategic importance of Baluchistan and, after the subsequent British occupation, !:ome form of development were naturally taken up. But these developments always remained a part of the wider defensive measures adopted on the western front of India and the British rulers of the Sub-continent hardly cared for the economic or social uplift of the people. Indeed, it is not uncommon to hear that it were they who made Baluchistan a backward country.

After the partitioning of India the old edifice was thoroughly destroyed and for better. A new order set in, a new history began. Necessarily, the old geographical aspects and their practical values also changed. \What was distant and remote yesterday for the old capital at Delhi became close and near for the new one at I(arachi. Measured in a straight line, Quetta was <1bont 700 miles from Delhi, now it is less than .')00 miles from Karachi. And, the "hostile" nature of the inhabitants of Baluchistan llaturally turned into a melodious harmony with the new government which was their own. Again, with the birth of Pakistan, Baluchistan no more remained only a military outpost. It acquirec1 a new importance as an integral territory of Paki!:tan. There is little wonder, than, that Baluchistan has already embarked upon its new career. Political reforms have already been introduced, agricultural, industrial, and other practical developments will necessarily follow soon.

In the new enthusiasm, however, we are apt to forget one thing-the region itself, as constituted by nature. We sincerely welcome and rejoice at the new era introduced in Baluchistan but we have to constantly remined ourselves, and remind others as well, what Goblet wrote in his 'Twilight of Treaties'. He said, "There can be no policy without political geography and no political geography without full knowledge of physical geography and human geography",

In the following pages, therefore, an effort is made to present some of the physical aspects of Baluchistan which may best be described as " the land of tomorrow."

2. Orographical relation with West-Pakistan

From orographical point of view, West Pakistan can conveniently be divided into two major units; *(a)* the Plains of the Indus and the tributaries, and *(b)* the huge complex of mountains and plateaus lying in the west and north-west of the former unit. Of the second, the mass to the west of the Indus Plain can again be sub-divided into two unequal sections, roughly demarcated by the gorge of the Gomal river. South of the Gomal there stretches an enormous plateau or tableland with complicating ranges of mountains running allover and enclosing a multitude of basins-generally situated at a height of 1,000 to 3,000 feet above sea-level. Some of these are 5,000 feet or more in elevation. Broadly speaking the plateau slopes gently to the south-west and merges into the desert of Iran; while to the south, across the low ranges of hills running parallel to the coast, it finally meets the Arabian Sea.

With the exception of a small re-entrant between the eastern most axes of mountains formed by the Suleiman and the Kirthar, the entire region forms a pnt of the Iranian Plateau which is the most dominant feature in the orography of S. W. Asia. Including the re-entrant, however, and covering a total area of 1,34,000 sq. miles, it forms our geographical province of Baluchistan.

3. Geological Origin

It is a significant coincidence that Baluchistan being a political unit of Pakistan is united with it by dint of a common geological origin, The forces and the movements

of our Earth which initially formed other lands in West as well as East Pakistan also caused the birth of Baluchistan.

Both the orographical units mentioned above came into being as a result of gigantic crustal movements which took place in the remote past. Millions of years ago, even before Man had appeared on the Earth, the western mass of mountains and plateaus, the northern Himalayas and their continuations in the East Pakistan and Burma, as well as the Plains of the Indus, the Ganges and the Brahamputra simply did not exist. Instead, the sites were occupied by a mid-Asiatic Sea called the Tethys. We can imagine it as an over-extended Mediterranean sweeping across the heart of the Old World in mighty meanders and linking the Atlantic with the Pacific Ocean. Perhaps these oceans, too, did not then exist in their present context. However, this classical sea of Tethys separated the Laurentia in the north from the Gondwana in the south. These ancient land-masses were the primeval crust-blocks of the Earth and their subsequent history is much confused. But we can safely maintain that Peninsuler India is a geological legacy of the Gondwana-land which, according to the geologists, extended from the Brazilian plateau through Africa, Arabia and Southern India to West Australia or, at least, it formed an aggregation of these widely separated and "drifted" regions of the Earth. Similarly, on the north, we now have the" Russian Platform" and the Central Siberian massif, which is called the Angaraland, as remnants of an older crust-block. We are further led to conclude that the bed of the Tethys formed a great basin of sedimentation for the rock-debris, mud and other material contributed to it by the bordering land-masses.

During the tertiary epoch of the Earth the isostatic equilibrium of the entire region commended by the Tethys was vehemently disturbed. Naturally, the processes for restoration of the equilibrium set in and movements in the bordering blocks of the crust started. As a result of these movements the bed of the Tethys sea was gradually buckled up; slowly, but steadily land appeared above the water in gentle folds; the folds increased in amplitude until in the Pliocene Age they attained their present distribution and mien. And thus the broad outlines of Pakistan and beyond were defined and" so too, the land of Baluchistan emerged out of its watery embryon.

But the course of subsequent development of Baluchistan as a region essentially differed from that of the Indus and the Punjab plains. In the case of the latter, a smooth and passive deposition of materials by the Himalayan rivers surpassed all other processes of land formation. In Baluchistan such a simple deposition never assumed great prominence although it had its local, and, therefore, negligible regime.

4. Physiographical Development

The evolution and development of the region in question was the composite result of three basic factors or " forces" as we may call them. These were, firstly, orogenic forces which had, as aspects of a wider phenomenon, caused the emergence of Baluchistan; Secondly, the igneous and the volcanic forces; and, lastly, the forces of weathering and land-erosion. It wii! not be possible for us to enter into a detailed study of these forces which shaped Baluchistan. Nevertheless, we must pay some attention to a few outstanding processes of these forces which seem to have directly controlled and contributed to the physiographical growth of Baluchistan.

5. Orogenic Forces and Their Regional Respondents

We have already mentioned the crustal movements which folded and raised the bed of the Tethys into one of the loftiest systems of young Folded Mountains. Now, it is believed that the movements followed a definite pattern on a wide scale. On the Western side, it is believed, the African "hinterland" moved towards the European" Fore-land ", on the eastern, the Angaraland moved against the stable-block of Peninsular India. In other words, we find, the Tethys sea was divided into two zones; each zone subjected to similar movements of one of the bordering crust-blocks, but with opposite directions of movements. It may, therefore, be concluded that between the two well defined zones there existed a Central zone of the Tethys representing an area of Criss-Cross movements. Here, then a confluence was formed for the "ripples" which were set up in the two separate zones. The folds advancing from the eastern and the western zones commingled with one another and formed into new series of folds often quite different in trend from their " parent" folds in the distant zones.

At this place mention must be made o(the decisive role of another crust-block, namely, the Peninsula of Arabia. Situated between the African and the Peninsular Indian blocks, \rabia acted as a resistant mass for the approaching folds and forced them to change their initial directions. Once the folds changed their directions tbe tendency repeated itself to establish an orogenic fasbion. Or, we can say that the successive folds gradually accommodated themselves to the nature and degree of resistance offered by the Arabian Peninsula. Together with this certain inexplicable sub-terranean obstructions also affected the run of these folds.

The net result of all these was a peculiar disturbance in that part of the Tethys-bed which raised itself to form Baluchistan. It was squeezed, so to say, between a number of diverse movements and, consequently, the rising folds, *i.e.* the mountain ranges, were somewhat twisted into a spiral form. The statement, although speculatively made, is clearly supported by the general configeration of the mountains which resembles the letter S. "On the east, the Suleiman range stretches upwards in gradually ascending steps to the Takht-e-Suleiman. The mountains then curve round in a westerly direction on the northern side of the 2hob river along the Toba K'akar Hills till the Central Baruhi range is reached. Near Quetta the direction becomes north and south but, from about 66th degree of longitude, the general trend is again in a westerly direction through Makran and Kharan ".* The' Central Baruhi range lies between 27°57' and 30°36' N. and 66°31' to 67°52' E. and includes" the whole mass of mountainous country between the Mula river on the south and the Pishin Lora and Zhob rivers in the north ".

On a closer study, it will appear that the Harboi Hills, in Kalat, form a knot. From this knot ranges of mountains shoot out in almost all directions. One goes towards the north; towards the south"west three or four r:lI1ges radiate t9 form the Siahan and the Makran ranges which run more or less parallel to the coast and to Ol]e another. In the far north the Chagai and particularly the Ras Koh range, running east to west, complete the

*Baluchistan—Imp. Gaztt. India (Provincial) p. 2.

picture; while, towards the south-east, the Pab range may be described as a distant outpost or offshoot of the same Harboi knot. In the north-east of Quetta, there appears another knot, higher in elevation, which shoulders the lofty peaks of Zarghun (11,738'), Khalifat (11,440') and others. In the east extends the longitudinal wall of the Sulaiman and the Kirthar which continues under the Arabian sea as submerged range and eventually turns west to proceed towards the Gulf of Oman.

Within the laps of these diverse mountain ranges lie the basins, the valleys and the plains of Baluchistan. Beginning from the north-east, we have the Zhob and the Loralai valleys which are about 5000 feet above sea-level; in the north we have the Sha'l (commonly known as the valley of Quetta,) above 5,000 feet; in the extreme south-east we have the plain of Lasbela; while towards the west we have a succession of sandy deserts and stony plains separated from one another by the parallel ranges. The larger valleys and basins are frequently made up of smaller valleys, each of which contains one or two principal streams which remain dry for the greater part of the year.

The enormous "squeezing" of the belt, which caused the characteristic configuration of the mountain ranges and formed their connected valleys, resulted in an extensive development of thrusts, overthrusts, faults and fractures in the rock-masses themselves. "Dislocations, mostly vertical to the strike of the ranges prepared the course (in the first instance) for rivers, as for example the Bolan, the Nari, etc.* "In fact, northern Baluchistan lies on the Great Boundary Fault of the Himalayas and the coast itself coincides with a line of faulting. We may close this section with the following words which amply convey the immensity of the effect. "The western edge of the Sarlath and Toba plateau is a great fault along which the eastern edge of the great Registan has subsided several thousand feet relatively to the elevated ranges. Faulting probably still continues and has not yet attained a condition of stability."

With such a background of crustal instability there is little wonder that Baluchistan is a land of recurring

*Memoirs of the Geolog. Survey, India, Vol. XVIII, Part 1, of 1881.

earthquakes. Earthquakes themselves, certainly, are not among the major forces of the Earth nor have they ever produced great landforms. But they, undoubtedly have an importance from human point of view. In Baluchistan some of them have been particularly destructive, as for example, the ravaging quake at Quetta on May 31, 1935. In the severe earthquake of December 20, 1892, apart from general destructions, the distance between Qaetta and Chaman lessened by 2i feet. But a few of these have also had constructive effect; for example, the frequent shocks felt in Quetta in 1888 had the effect of increasing the water supply in Chachezai Karez in Shorarud. Similarly the shocks in 1900 caused a spring to appear in the Sraghurgi village on the slopes of Takatu.

6. Igneous and Volcanic Forces

The general effects of igneous forces can best be summarised in the following words "The triassic shales and limestones, forming an extensive outcrop south of the 2hob valley, are profusely injected by great intrusive masses of coarse-grained gabbro, often altered into serpentine, and innumerable dolerite or basalt veins and dykes of the Deccan trap age. To this period also belong many of the igneous rocks, both intrusive and eruptive, which occur abundantly in all the regional types. A second group of igneous rocks is represented by deep seated intrusions, without any connexion with volcanoes .... *". Besides the purely geological interest, these igneous forces have imparted an economic significance to Baluchistan. The serpentines, mentioned above, contain valuable loads of chrome-iron ore; while lead, copper, sulphur, ornamental stones etc occur abundantly elsewhere, chiefly in the Chagai ranges.

The alteration of rocks by igneous forces, or metamorphism, is not easily visible to the common eye nor the results of it can be fuily appreciated by the untrained observer. Nevertheless, these are among the fundamental aspects of the region and, as we have just noted, these had often been closely associated with the forces of volcanicity.

*Baluchistan, Imperial Gaztt. (Provincial). P. 7.

Baluchistan is situated in the Alpine-Himalayan volcanic belt and although most of the volcanoes have become exhausted they are directly related with those of Persia, Turkey and the Mediterranean. Physiographically, these volc~ln()es have lent a distinctiveness to Baluchistan; while as a landform they stand out in bold contrast with the rest of Pakistan.

These volcanoes, recent and sub-recent in origin, form a series of scattered hills in the triangular strip of country lying to the west of Chagai and known as \Vesteren Sanjarani. First of all we have the Koh·i-Sultan, separated from the main Chagai Hills by 30 miles of sandy expanse; farther west, are the Damorlin H ills and several other isolated peaks of volcanic origin; twenty miles mare to the west is another peak called Koh-i-Da!il. . All these are between 4000 to 8008 feet high rtnd some of them rise abruptly out of the sandy plains with precipitous slopes. A mong them the most impressive is the Koh-i-Sultan, named after Sultan Pir Kaisar who is a mythica 1 patron saint of the Balochis. 'vVe are obliged to Mr. Vredenburg for the following description of the Koh.

> "The Koh-i-Sultan is an oval shaped mountain whose longer axis striking west-north-west is a bout 17 miles, the transverse width being 10 miles. It is an extinct volcano consisting of rocks very similar to those of the Koh-i- Tafdan, but instead of forming one cone the centre of eruption seerns to have shifted several times, so that the mountain is really an aggregate of three distinct cones, now greatly denuded, whose centres are disposed along olle straight line .... The original summits of the three cones have been entirely denuded, away. The western cone has been denuded to such an extent that it now forms a great circular plain 4i miles in diameter, surrounded by a beautiful amphitheatre of cliffs. It is an instance of the kind of feature termed by Lyell 'a crater of denudation'. The cliffs that surround this amphitheatre consist almost entirely of accumulated ash-beds. They do not everywhere rise to the same height in one broken line, but have been v;lriously shaped by the agencies of denudation; some portions which have been less

> denuded stand out as isolated masses or as ont-standing pillars, like the Neza-i-Sultan". Vredenburg further adds: "The three cones appear to have succeeded ()ne ancther in the direction of west to east, but the ernption may have been partly simultaneous ....".

Besides these massive volcanoes, which are happily dead we have a number of mud volcanoes in Makran and the Kundar valley of the 2hob District which remain bubbling up even f0r to-day. Like earthquakes, these volcanoes also remind us that all is not yet quiet with Baluchistan. The initial forces are still operating within; and considerable changes in the surface patlern may possibly take place in the long run.

7. **Weathering and** Land-Erosion

We now turn our attention to the role of weathering and erosion in determining the physiographical personality of Baluchistan. It will not be an exaggeration to say that the economic, human, and scenic values of the region <Ire the direct products of the forces of wea ther, wind and water. By disintegrating the rock masses, weathering has produced the scree beds which form the reservoirs of underground water used through karez ; by transporting the finer constituents of rocks and by re-depositing them in the valleys, winds have given us the loess without which most of the valleys, now fertile and green, would have remained barren; last but not least, weather, wind, and water by eroding the land extensively and producing the weird panorama have considerably affected the mental outlook of the people as well.. Here, in Baluchistan, the mind of man is still a clean mirror of the immediate material environment; man is still the child of nature in Baluchistan.

" Weathering" implies the breaking up or decomposition of exposed rock masses, thus rendering them fit for transport by water, ice, or wind. Erosion is distinct from weathering; it refers to the process of "gnawing away", the "carving" or" sculpturing" of the land. The natural epilogue of erosion is deposition of the material eroded away. Obviously this implies transportation. \;Veathering, transportation, erosion, and depositioll, therefore, are the complex processes of the same general

phenomena. However, we shall consider them somewhat separately in order to appreciate their collective control or effect. .

8. Weathering

Before entering the field of weathering, we must keep in view the geological and the climatic background of the region at large. The mountains of Baluchistan, as a rule, are composed of limestones, shales, conglomerates, or of white clay as in Southern Makran. Limestones are well-jointed and pervious to water and are characteriseq by a high degree of solubility; and the jointing factor renders the hydrology and topography of limestone areas highly distinctive and peculiar. . The removal of the rock from the general surface takes place largely through solution; joints are widened into gaping fissures or clefts while cylindrical "pipes ", "swallets," or" ' swallow-holes" may also be dissolved out.. Shales and clays belong to the argillaceous class of rocks which is characterised by general softness and the absence of clear-cut divisional planes. They are resistant to chemical weathering and erosion except under the extreme conditions of tropical climates, but they yield readily to mechanical agents. Conglomerates are coarse fragmental deposits. They show few signs of bedding and have ill-developed jointing. Their resistance to weathering processes often depends more upon the hardness and solubility of finer material occupying the interspaces than on the characters of the larger fragments. If the former is of low resistant power, the rock readily falls to pieces. In short, the general destructibility of the rock-masses is characteristic of Baluchistan. On the climatic side, so far as weathering is concerned, we have only to remember that it is a land of large diurnal range of temperature.

The general destructibility of the rock-masses and the large diurnal range of temperature have naturally resulted in a tremendous disintegration of the entire region, Masses of rocks everywhere, initially compact, have been cleanly cut through into huge blocks and these, in turn, have been broken up into boulders and large fragments of angular dimensions. The complete "shattering" of the rock-masses, due to alternate expansion and contraction of the rocks set up by acute diurnal range of temperature, has been considerably helped by the mechanical

action of frost in certain restricted areas particularly in the upper highland part of Baluchistan.

The ultimate result of such extensive disintegration is seell in the formation of scree beds which are one of the salient features of the country. These are locally called " dOlman" or skirt of the mountain. In order to give a satisfactory description of these" damans" we can do no better than quote Mr. Vredenburg. He says, "Owing to the absence of any powerful drainage, these deposits attain a considerable size and 'daman' reaches proportions almost comparable to those of the mountains whose debris h';l.ve formed it, reaching higher and higher upon its slopes. The gradient of these taluses is so low that the eye can hardly realize the great height which they reach up the mountain slopes, and this explains the dwarfed appearance of many of the hill ranges notwithstanding their considerable altitude." Many of these boulders and fragments torn from their parent mass are curied into the plains by unusually heavy showers of rain. These boulders and pebbles are thus spread over the surface of the plains and finally form the" dashts" of Baluchistan. vVriting about these Vredenburg adds," The outer surface of nearly all the pebbles is coloured black through the oxidation of iron compound ,'. This is an instance of chemical weathering or decomposition which is not unfamiliar at all.. Besides, chemical corrosion due to evaporation of water containing minerdl matters in solution is particularly noticeable in the western desert portion of Baluchistan.

Erosion

As in other arid regions, the essential factors controlling erosion in B.:lluchistan are the absence of vegetation and the excess of evapordtion over rainfall, In Baluchistan vegetation is conspicuously absent while rainfall hardly averages ten inches. Naturally the erosive work of water decreases whereas that of wind increases in proportion.

The winds in Baluchistan are characteristically dry and are often powerful and steady in flow, particularly the " gorich" or the northwest wind. These winds are naturally armed with quartz which is the dominant mineral of ordinary sand. Striking against the masses of limestones, shales, conglomerates etc. of which Baluchistan is made, these quartz-laden winds have performed an

immense amount of corrasion and have produced a myriad of minor features often resembling the characteristic "mushroom-forms", "Zeugens", "yardangs, windows" and even small hollows on the ground. Some reference has :llready been made to the eroded aspects of the Koh-i-Sultan Here we may note that one of the principal peaks of this koh bas been so eroded that it bears a resembbnce to the sphinx.

In addition to the gorich, strong currents of dry air are produced during summer by the thermal condition and these currents, in turn, produce violent dust-storms which precipitate the normal process of wind-erosion. Such duststorms are common everywhere in Baluchistan, but are particularly frequent and damaging in the west and the south. Writing of these sand-storms in the western areas Sir Henry McMahan says, "The earth and sky become one mass of flying sand. It fares ill at such times with anyone who struggles even a few yards from the line of March. Five minutes of a sand-storm would obliterate the deep tracks of an army corps". And some idea of the spectacular changes in the initial surface conditions brought about by the deposition of the mass of sand, carried by a wind or a storm, can be had from the following description of the hills of Chagai. "These hills", writes McMahon, " are all being gradually covered up and buried in sand which is relentlessly creeping further and further up their sides. Many are already completely buried, and a high mountain of sand marks their burial place. Others have their black peaks appearing out of the white expanse of sand slopes. Here and there a loftier mass still towers with its black crags high above the devouring waste around, but the sand, banked up on their sides in places sometimes 1000 or 2000 feet above the level of their b::tse, foretells a similar fate in store for them."

Closely connected with the above is the phenomenon of sal)ddune. In his "wanderings in Baluchistan". Charles McGregor has graphically described these dunes. "All are Bhaped alike, and are of the form of a crescent, the horns being to the south, and the toes to the north, They vary a good deal in height, the top of the largest one being about 60ft above the plain and sloping down gradualfy to the horns, where they mingle with the sand. The outer slope is at an angle of about *30°,* bulging a

little in the centre and the inner at about 45°, or as steep as sand will stand. At the top of the outer slope and at the toe of the crescent is a steeper slope about 3 ft.. in depth and this gradually di3appears at the horns where the whole outer slope in uniform". These are, par excellence, the *Barkhans* or crescentic dunes of which we read so much in our books on Physical Geograyhy. *Barkhan,* is also the name of a tehsil in the Loralai District of Baluchistan. It may not be improbable that the naming of the tehsil bears a symbolic relation with the crescentic dunes of the western deserts which is a most impressive natural feature of the country.

A very high degree of mechanical corrasion, powerful sand-storms dunes and *bat'khans,* then, are some" of the outstanding achievements of wind in shaping the physiographical personality of Bdluchistan. To these we may add yet another. Most of the valleys consist of loess deposits and these, as we know, are formed by accumulation of wind-blown dust. . Even in the plains the alluviam is mixed with loess. In a land composed entirely of limestones, shales, clay, sand and gravel the importance of such a fertile soil, as loess, cannot be overrated.

Besides wind, water has also affected the Physiographical development of Baluchistan. U ncheded by surface vegetation and readily guided by the joints (If limestones, rain water has caused countless "gullies" on the sides of mountains and, elswhere, has carved the country into" bad-land". 'vVe have already mentioned" the stony plains or "dashts " formed by the transportation and subsequent deposition, by flood water, of pebbles anq boulders originally belonging to the huge taluses. Floods, irresistable and sudden floods, are not at all uncommon in Baluchistan; but, paradoxically enough, there is no "flood-problem" in the region. " The conformation of the surface of the country renders much damage from "floods impossible". The real problem is the rushing hill-torrents which wake up after a local and comparatively insignificant rainfall. . In Baluchistan even a paltry shower may result in torrents which, though short.lived, are particularly destructive to the land and the people: III the past these torrents, cutting through the ranges, formed deep and narrow gorges which become "deeper" and deeper as the level of the river sin1(s lower and lower' every year. Such narrow gorges and denIes have aften attain •.

ed terrific depths, for example the Zao and the Gat defiles in the Suleiman range are about 2000 feet deep and in most places, are only a few yards wide. In the memorable words of Sir Henry McMahon" it is hard to imagine anything fint;r than some of these gorges".

Broadly speaking these defiles and gorges have formed the main lines of communication with the valleys within as well as the world without. A few of these, have become the classical mountain passes as the Bolan or the Mula Pass through which a detc<chment of the army of Alexander the Great marched back, under Crateros, from the Indus valley in 325 B.C.

The process of water-erosion, is not coi1fined to the surfacej it transcends into the sub-surface and gives rise to equally important features-perhaps more important ones from economic point of view. The characteristic attri. butes of limestones have already been noted above, but for the sake of emphasis we may repeat that the outstanding characteristic of a limestone is its solubility in rain Water which is only accentuateci by the system of joints in it.. Naturally, surface water in Baluchistan finrls easy and spontaneous percolation downward and works up a number of marvels. The most obvious result is that a river after its first appearance on the surface in its usual manner and having moved along its channel for some distance will disappear underground and re-emerge a little lower in its course. This hide-and-seek play is characteristic of the hydrology of the land and has resulted, partly at least, in the formation of dry-valleys and dry river-beds which are so numerous in Baluchistan. PercQlating in the scree-beds, these uuderground waters have become the main source of karezes and, uuder favourable circumstances of rock-Conformation have formed springs which, in turn, have become the focii of human settlement and economic activities. There is another related feature, artesian well, which is now assuming a greater and practical importance in Baluchistan, particularly in the Quetta-Pishin District. . An artesian well is not a new discovery in Baluchistan. There are mlOY such wells in Quetta town as well as in Quetta Tehsil and, as the Irrigation Commission of 1903. had pointed out, "Baluchistan holds, more hope of securing artesian supply of water at moderate depth than in any 0ther part of the Sub-continent. The real

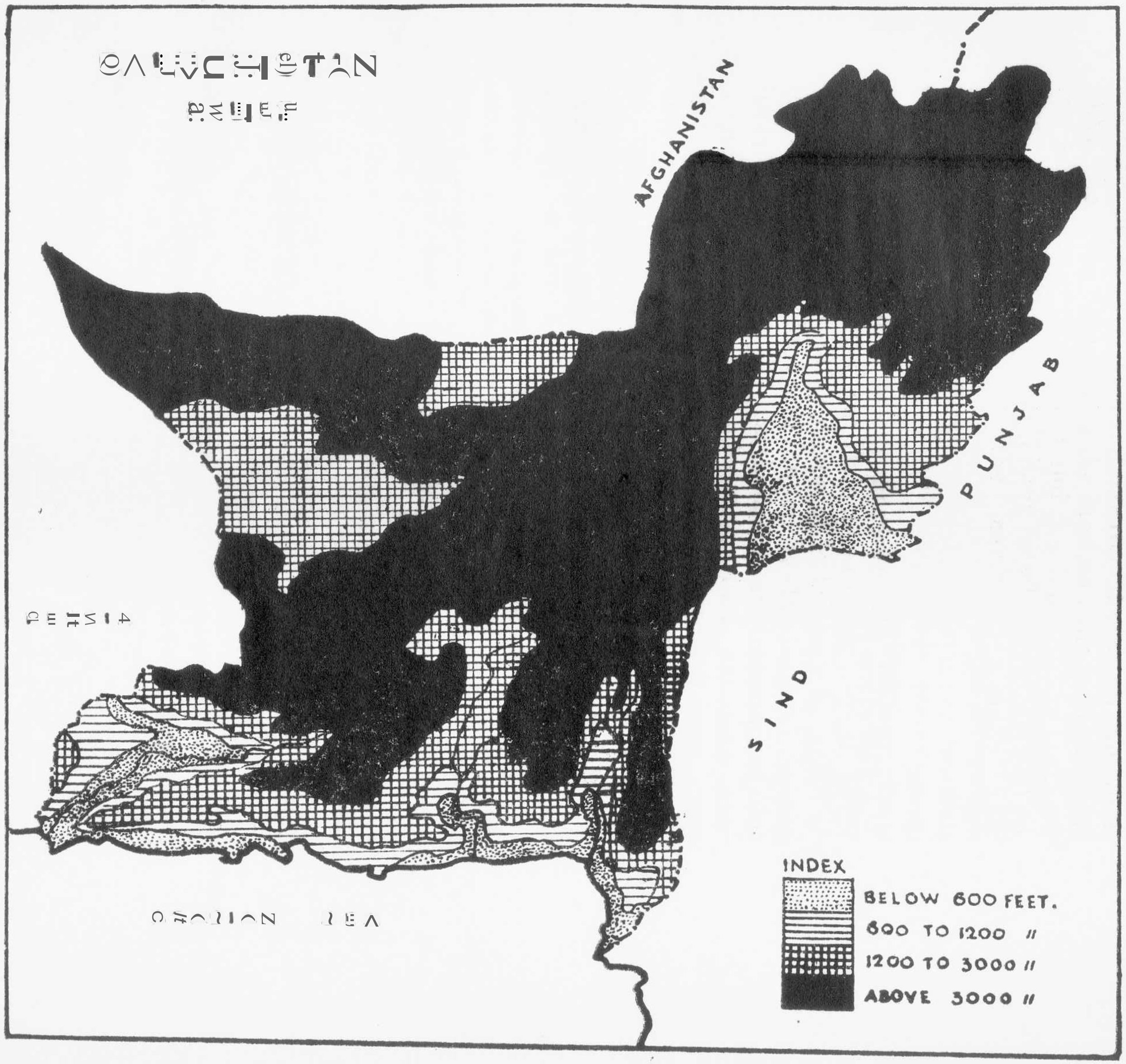
AFGHANISTAN
PUNJAB
SIND
INDEX
BELOW 600 FEET.
600 TO 1200 "
1200 TO 3000 "
ABOVE 3000 "

object discovered of late is the fact that these hidden fountains of Nature and sym bolicaJly all other natural resources of the land have to be searched out and exploited. Only then the economy of the land and the prosperity of the people can be ensured and developed to the required' level.. And for this we shall have inevitably to depend on the twin sciences of the earth-Geography and Geology.

Conclusion

So far, we have briefly discussed the chief forces of the earth which shaped our Baluchistan as a region quite distinct from any other region of Pakistan. Born out of the Tethys-bed, folded and faulted by the orogenic forces, frequently attacked by earthquakes and tormented by volcanoes, Baluchistan underwent, and is constantly undergoing, heavy disintegration rendering it easier prey to the forces of wind and water.

The nature of drainage and climate and their respective consequences on the land and the life of the people we shall study next.

(To be Continued)

PAKISTAN GEOGRAPHICAL REVIEW

1952 VOL. VII
NO. I

ANNUAL SUBSCRIPTION :
INLAND . . Rs. 4/-
FOREIGN . . Rs. 6/-

CONTENTS

Page

1. Deposits of Coal, Iron and Bauxite in the East Indian Archipelago *by* S. J. Mayne, (Excluding the Philippines and Australian New Guinea) ... 1

2. The Physiographical Personality of Baluchistan *by* S. Zoha ... 20

3. Value of Geographic Training and Careers for Geographers in Pakistan *by* Nafis Ahmad ... 30

4. The Natural Frontier of Pakistan *by* Khalil Ullah Kureishy ... 35

5. Physiography of Chittagong Hill Tracts with Special Reference to the Karnafuli Valley *by* A. I. H. Rizvi ... 53

THE PHYSIOGRAPHICAL PERSONALITY OF BALUCHISTAN*

S. ZOHA

1. Introduction.

In the previous article we had, *inter alia*, referred to the role of water in shaping out the physiographical personalisty of Baluchistan without considering there the drainage system in particular. But now with a satisfactory picture of the surface conditions before us we may proceed to describe it in some detail. Before we do so it seems desirable to mention two important facts related to drainage in general. Firstly, drainage is a subtle resultant of the interacting conditions of precipitation on the one hand and of land on the other with the added influence of man. Man by destroying forests and other forms of natural vegetation, by digging out canals, or by constructing dams on the rivers and thus diverting the natural flow necessarily interfere in the original pattern of drainage as initiated by nature; and nature herself, in course of time, modifies the pattern. Yet with all this, and much more, drainage remains a salient element in the environment—a basic trait in the personality—of a geographical region. Secondly, the term "inland drainage", so commonly used, in a way, apt to be misleading, for it points to a peculiar fate of disposal of run-off, not to an actual pattern—at least not always so. After all, if the rivers of a region invariably dry up in the sands or empty themselves into salt lakes (inland drainage) they leave no big problems to be solved except, of course, the problem of irrigating the land if and when necessary. Such rivers have a finality of process and event; and human adjustment is comparatively easier and simpler. But if the rivers, whether they flow into equatorial waters or polar bays, have no such finality or they change their regime frequently, they are decidedly a problem of first magnitude.

In his Çensus of India Report (1911) Sir Denys Bray characterised Baluchistan as a land of contradictions and contrasts. "For a brief and fitful season", he said, "its rivers are rushing torrents, for the greater part of the year there is hardly a trickle in their giant beds." Most of the rivers of Baluchistan

*Continued from Vol. V No. 2.

literally conform to the above description. But there are quite many which remain waterless not only for a greater part of the year but for many consecutive years while a few, on the other hand, somehow manage to maintain a tricklish flow all the year round.

The explanation of these variations lies partly in the differential distribution of rainfall and partly in the differences of regional or local structure. A detailed analysis of these factors is unfortunately not possible within the limited scope of the present article ; even if attempted, in the absence of scientific date, it would naturally remain largely hypothetical. For the present, however, we can only treat the main rivers of the country in their ordinary existential pattern.

2. Rivers of Baluchistan.

On the extreme north a few miles north east of the Sakir (10,125′) in the Toba Kakar Range rises the Kundar River and flows through a valley of the same. It runs first eastwards then southwards until it again turns north east and, running upto Domandi, meets the Gomal River to exit into the N. W. F. Province after passing by Khajuri Kach. A portion of the river serves as the Baloch-Afghan boundary. Despite the considerable political importance thus attached to it the, Kundar is a typical river of Baluchistan—a river without water. South of the Kundar we meet the Zhob River. It rises in about 67°43′ E. long. and flowing through the centre of the Zhob Plain joins the Gomal near Khajuri Kach after a run of 240 miles. The channel of the river remains waterless for the first 45 miles upto which it is called Lahar ; the rest which has a perennial stream is celled Lora. "The Zhob is a sluggish, turbid river, flowing in a channel varying from 40 to 80 yards in breadth between scarped clay banks about 15 feet high and quite disproportionate to the volume of water usually flowing in it. It is a shallow stream, seldom exceeding two feet in depth in the largest pools and in many places not more than about six inches, and about twenty feet in breadth."[1]

The Zhob River is flanked on the south by the Anambar which rises in about 67° 46′ E. long. as a hill torrent. Flowing east and south east for about 82 miles from its source, under the name of Loralai or Lorali, it receives the Sehan River from the north east and takes an abrupt turn to the south. Here it

1. Baluchistan District Gazetteer Vol. 9 p. 18.

is called the Anambar. Running north to south it traverses the tribal territories as the Beji River and flows south west and then south to debouch into the Kachhi lowlands as the Nari River. The total length of the river in Baluchistan is about 300 miles. Its bed is generally covered with shingle. The principal tributaries are the Kohar or Babai, the Siab the Sehan and the Narechi, all from the east, The Kachhi lowlands of Baluchistan, besides receiving the Nari in its dissipated channels, receives the Bolan River from the north-west. The Bolan rises in about 67°35′ E. long. and frequently disappearing in its bed is finally dissipated in the lowlands after its mountain course of 88 miles. " Unlike the Nari which has a level bed, the current in the Bolan, especially during floods, is very violent owing to its steeper banks and shorter length."[1] We may also mention here the Mula River which passes with a rapid fall through the Central Brahui Range under various names and exits into the south western corner of the lowland.

In Western Baluchistan, beginning from the south, the Kech-Makran valley is drained by a number of torrents descending from the slopes of the bordering ranges of which the Kech-Kaur, flowing from the east, and Nihing, from the west are most important. The two rivers unite to form the Dasht River which breaking through the Gokprosh range, past Talar Band, falls into the Sea by a large tidal creek. Like its affluents, the Dasht is not a continuous stream and fills only after rains. The average depth of the banks is about 25 feet and the width about 200 yards. Northwards, the Rakhshan River drains through the Panjgur Valley. The Rakhshan rises near the junction of the Siahan and the Central Makran range in the eastern side of the Valley, under the name of Nag ~~and flows~~ west-south-west parallel with the Siahan and then, turning northward it bursts through the Siahan Range having joined the Mashkhel River from the Persian side. It then runs under the latter name along the western side of the Kharan basin and enters the Hamuni Mashkhel after a total length of 258 miles. " Though a considerable watercourse, the banks of the Rakhshan are low, shelving and irregular, consisting of the hard clay known as kork. In Panjgur the average depth is about six feet and the width about 1½ miles."[2] The Hamun though described as lake is only a large depression, 54 miles long and 8 to 22 miles broad. There is never much water in it except for a short time after heavy rain. Of the rivers of the Kharan basin none is as important as the Mashkhel River. Most of the rest are only hill torrents which " never contain water except for a few hours

1. **Military Report on Southern Baluchistan ; p. 23.**
2. **Baluchistan District Gazetteer ; Vol. vii ; p. 21.**

at a time in the rare event of a shower of rain". Similarly, in the plains of Chagai the only river with a perennial flow is the Khaisar, besides the lower course of the Pishin Lora and the Tahlab River on the Persian border.

The Pishin Lora rises in the western slopes of the Kand in the Toba Kakar Range, opposite the sources of the Zhob. Flowing south west through the Pishin Valley it bends north and after a detour in the Afghan territory it re-enters Baluchistan from the north and draining through the Nushki, it finally enters the Aamuni Lora. The Hamun is similar to the Hamuni Mashkhel only it is much smaller. "The great amount of silt brought down by the river accounts for the filling up of existing channels and the consequent formation of new ones. It is by reason of these changes that the river is unable to excavate for itself the enormous bed which it possesses higher up, and in big floods the water not only completely fills the channel but overflows forming several new courses for itself."[1]

Contrary to the Pishin Lora, the Hingol, the Porali, and the Hab rivers all flow from north to south into the Arabian Sea. The source of the Hingol lies in the prox imity of 29°N. Lat., at the head of the Surab Valley. Known by a variety of names, such as Raj, Gidor Dhor or Nal Kaur, it drains the western side of the Jhalawan division of Kalat State and the north eastern portion of Makran. Like most of the rivers of Baluchistan, the Hingol contains no water in its upper course. Even when it does it requently disappears in underground channels as others do. Yet with a course of 358 miles, the Hingol claims to be the longest river of the country. The Hab and the Porali both rise in the north of the Pab Range. The former runs south east for 75 miles and then bending south west falls into the Arabian Sea near Cape Monze after a total length of 240 miles. The latter draining the Las Bela region enters the Sea at Miani Hor after a run of 175 miles. Owing to the silting of the main channel a branch of the Porali conveys the flood water into the Siranda Lake. The Lake is about 9 miles long and 2 miles broad and has an average depth of 3 to 5 feet but when flooded the level may rise to 10 or 12 feet.

3. The Drainage Pattern.

A further study of the main arteries of drainage mentioned above, would bring us nearer to the hydrographical peculiarities of Baluchistan; and they

1. Ibid ; Vol. ivA ; p. 20.

could be summarised as follows :—

(a) The drainage of the country has, so to say, a centrifugal pattern. The principal watershed lies in the Central Brahui Range, approximately along the 67°E. long. with a secondary one running transversely along lat. 29°N. Consequently, the main rivers sprawl out in all direction.

(b) Within this primary pattern there exist large and small basins of various dimensions in which the drainage, though not exactly centripetal, is yet somewhat analogous to it in the sense that the torrent beds descending from the surrounding hills run into a common channel below which forms the hydrological axis of the area.

(c) The individul basins of of drainage enclosed by hills, however, do not stand in absolute isolation from one another. There is always a connecting link, a *tungi* or a steep gorge formed by the abrupt bend of the main river and the deep incision of the separating hills. These form the famous *laks* or passes of the country without which the movement of men and the transport of material in Baluchistan would have remained a tragic impossibility. In addition to providing the vital economic linkage these *laks* have imparted to Baluchistan a deep colour of sociopolitical uniformity and have, through a process of controlled communication, preserved its age old human institutions and historical distinctiveness without causing a baneful stagnation. And all this, must be repeated, is not the result of human will or effort but a natural product of the drainage of the region.

Among the other important hydrographical features of Baluchistan we may mention the fact that almost every river is basically impermanent ; it is always waterless except during brief periods of heavy floods. And, with rare exception the various rivers after an apologetic surface flow sweep down into subterranean passages from where they emerge on to the surface only to disappear again.

Apparently these features—the flood and the underground flow—have nothing in common. But, from human point of view, they have a common meaning : in each case the little but precious water which the region possesses and is periodically supplied with by nature goes to waste. In the former, the loss is

as sudden as violent ; in the latter, it is slow but not as slight as generally supposed to be. (An efficient harnessing of the flood and an intelligent utilisation of the subterranean water, therefore, are the twin problems associated with the drainage system of Baluchistan.) Discuss.

4. Phenomenon of flood.

[In a purely physical sense, the floods in the otherwise insipid rivers of Baluchistan have been of enormous value, for by accelarating and intensifying the process of erosion and deposition they have filled the framework of rugged mountains and barren hills of the country with level and smooth plains smiling in contrasting fertility.| And agriculturally, their importance can be well imagined by considering the typical case of the Porali River in Las Bela State. Here the Kharif crops are matured by one watering only viz., by once soaking the bed of the embanked fields the flood season which occurs twice a year, in summer and in winter when they are few and uncertain.

But these advantages of the floods are almost inseparable mixed with the ravages which they bring to the land and the people alike, for the constructive processes of all the natural agents, particularly of the rivers, beyond a certain stage turn into destructive ones if allowed to operate freely by man.| The human measures adopted to control the processes naturally vary in accordance with the " mechanism " of the agents, and extent of the result desired to be obtained, and the means or resources of control available to man. As far as the control of flood is concerned we find that no satisfactory measures have been evolved and adopted by the people of Baluchistan except the primitive ones, for example, diverting the flood waters into the thirsty fields by constructing earthendams across the river beds. In fact, in quality these dams appear to have fallen inferior to the old barrages or *gabarbands* whose relics are found scattered all over the country. The static, if not actually retrogressive, nature of these measures is all the more undesirable in view of the fact that Baluchistan has undergone a distinct and somewhat progressive desiccation.

A general idea of the inadequacy of the existing nature of flood-control may be had from the fact that embankment are made of earth and boulders. As no regulating arrangements exist at the head of the embankments, water at high floods enters the flood channels, taken off from the up-stream, with enormous

force widening the very channels themselves. After repeated onslought these channals naturally assume the shape and size of big ravines cut deep into the cultivated land, and they go on increasing in width at the cost of the fertile land which is naturally limited in extent. Frequently the flood water rushing through the primitive channels forms a spill-area and cuts smaller side-ravines connecting the larger ones, thus slowly but steadily transforming the whole cultivated area into a characteristic waste-land. And, with the collapse of the primary embankment which is not infrequent, the catastrophe is made complete.

Here we may also summarise the distribution of flood in space as well as time. The Zhob River is generally flooded in July and August but has never caused any serious damage. Similarly, floods have not been of frequent occurrence in the Loralai District whose rivers like the Zhob get inundated during summer. In Chagai, floods almost invariably occur in winter when the bed of the Khaisar River is sometime filled to the brim but seldom for more than a day. The Pishin-lora, again, is flooded in the winter but owing to the large area commanded by the Lora and its tributaries the floods are sometime very heavy and descend with great violence but they run down as rapidly as they rise. In Makran the Kech-Kaur in the centre of the Kej valley as well as the Nihing cause much diluviam. The rivers of Kharan likewise swell in winter The case with Sibi District is different as severe floods are of frequent occurrence. "In 1885 when the Sind-Pishin Railway was under construction, the Harnai Valley was visited by a series of severe floods, and one of these, which lasted for six days in April swept away several bridges and many miles of temporary roads, caused numerous accidents and did an infinity of mischief, destroying camping grounds, giving rise to malaria and stopping supply of food. After an interval of five weeks the floods again came down more severe than ever ....and this state of successive catastrophes went on without cessation till the end of May."[1] The Nari River is too well known for its notorious spates. Sudden floods in the Bolan too are frequent. "It was such a flood that utterly destroyed the Bolan Railway ere the Mushkef alignment was adopted."[2]

(1) Baluchistan District Gazetteer, Vol. iii, p. 21.
(2) Holdich, Indian Borderland, p. 15.

5. Underground Water.

We may now turn our attention to underground water. In a country where rainfall is so little and uncertain and surface supplies so limited, the subterranean water has naturally dominated the imagination of its dwellers and given rise to various superstitions and semi-religious beliefs./ Hundreds of Saints or Pirs, dead in their stony shrines, continue to receive offering for their many miracles connected with the production of water from the ground. In the Bolan Pass, near the southern end of the Bibi Nani bridge, lies the shrine of Bibi Nani who is "the guardian-saint of the water supply". The Kuchiks a section of the Rind Baloch, formerly used to allot a few *Kasa* of grain per *tir* at each harvest to the shrine, the grain thus collected being used for the purchase of sheep which was sacrificed whenever a party of the cultivators went to repair the water-channel. Since 1895 the sacrifice has ceased and it is alleged that the water in the Kaur Bibi Nani, the western tributary of the Bolan River, has decreased in consequence. The brother of Bibi, known as Ghaib Pir by Muslims and as Mahadev by Hindus, is said to have miraculously produced a spring in Sarawan at the spot where he sank into the ground on being pursued by the Gabrs or Zorastrians. The large spring called Chashma at Kalat is said to have been produced by Pir Chatan Shah. One Pir Lakha produced water by his foot from the ground, marked by his shrine, in such a large volume that it flooded part of Sind ! The same Saint has another shrine dedicated to his name in the Loralai District where he is said to have produced three springs of water. Similarly Pir Chhatta produced the springs at the place bearing his name. The water which irrigates the lands in Shahrig is said to have been produced by Shaikh Musa. But Pir Bokhari, whose shrine is held in great reverence by the Wanechis, appears to have surpassed all other in the matter, for he turned the Pui stream into a stream of pure milk !

And these miracles are not attributed only to the dead ; actual living human beings are as often believed to have the power to increase, decrease or stop the flow of springs, rivers, and karezes.

6. The Significance of Superstitions.

Superstitious undoubtedly these tales are, but we may here pause to reflect on their probable significance to us. In the first instance, we must note that none of the prevalent stories suggest the presence of any power.....

god or ghost......superior to human beings the power to produce water from ground, to increase, decrease or stop the flow of rivers and karezes and springs, all these miracles are invariably attributed to some man or, less frequently, to some woman. Religion, precisely speaking the Islamic faith of the bulk of the people of Baluchistan, has certainly precluded any tendency to associate physical phenomena to superhuman agencies. But so far we know, there is no direct evidence to show that any such association had flourished in the country either in the pre-Islamic period or among the non-Muslim groups of its inhabitants. It may be of some interest to mention here that the Loris of of Baluchistan " look upon fire with special reverence as God's gift to David brought from purgatory where David begged for the wherewithal to melt iron." Although for quite a different reason, the reverential ceremonies associated with fire strongly reflect the neighbourly influences of Persian Zorastrianism, Indian Hinduism too had found its way into the country. There are ample evidence of deityworship both in ancient and comparatively modern times, for example, clay-figurines of women have been un-earthed from the pre-historic sites of the Zhob and the Kulli cultures, but they almost entirely represent ordinary domestic deities or, in certain cases, the goddess of Fertility. Despite these gods and goddesses and many other influences of Hindu religion and culture there is nevere-theless, a conspicuous absence of reverence for water and the corresponding water-goddess. There are no hymns sung to the praise of water, there are no elaborate and ardously pious '*ashnans*' as we find on almost every bank of every river in Northern India. The absence of a Jamuna or of a Ganges in Baluchistan may partly be responsible for it ; principally it seems to be due to some other fact.

A more peculiar feature has still to be noted. The traditional 'guardians of water supply', the *pirs* and the saints having full control on the rivers, the karezes etc., have implicitly no control on water from the air. They do not command the clouds and have not reportedly caused rain. Without stretching the matter too far, we probably would be justified in asking why a *pir* who could and did produce water from ground did not produce rain ? Why there is no such story ? Why no shrine dedicated to any ' guardian of rain ' at all ?

There can be one explanation of all this. The inhabitants of Baluchistan, these illiterate folks, have sub-consciously experienced the full import of their

peculiar environment. Beneath the cloak of the superstitions they seem to have the knowledge that men can and does command the land but not the air ; of the elements of land, water is the most vital and directly within human access for utilization, and, as ground water is rare in the country, it can best be utilized through the good offices of a holy ' guardian '......the person who has the knowledge of hidden resources of water and in whose perpetual awe no major waste of water could be allowed or tolerated.

We have digressed too far from our original theme and probably we have attempted to put in too much logic in the superstitions of the people. But here, as in other contexts, we do not exactly deal with the superstitions themselves. Moreover, the so-called superstitions are really manifestations of a deeper aspect ; thay are indications of the processess of mental adjustment with the elements of environment forming the elementary bases of thought, habit and action ; and, in a land like Baluchistan. habits of thought and action cannot be easily ignored in the zeal for rapid development and reform.

zoha
Previous Nex

Balochistan Bibliography

(1510) Zoha S. (1950-51) The physiographical personality of Baluchistan. Pakistan Geographical Review, Vol. 5 (2): pp. 1-15. & Vol 6(1): pp. 20-31.

and Afghani Drug Users in Quetta, Pakistan. JAIDS Journal of Acquired Immune Deficiency Syndromes. Vol. 32(4): pp. 394-398,

(3521) Zaidi S.M.H., S.M. Ashraf and A.A. Afridi (1982) Program development of drug abuse control in Baluchistan Pakistan. Bulletin on Narcotics. Vol. 35(1): pp. 23-26.

(3522) Zaman H. (1967) Tribal life in Baluchistan. Pakistan Quarterly, Vol. 14(4): pp. 24-29.

(3523) Zoha S. (1950-52) The physiographical personality of Baluchistan. Pakistan Quarterly, Vol. 5(2): pp. 1-15 & Vol. 7(1): pp. 20-29.

SHAMSUS ZOHA, 1924-1969

For any field of learning there cannot be anything more unfortunate than the passing away of a promising scholar who possesses talent and potential to do creative work. In the late Shamsuz Zoha (may he rest in peace) we, the Pakistani geographers, have lost one such colleague. He combined in himself the qualities of a scientific geographer as well as that of a gifted poet. His sad and untimely death occurred on January 13,1969.

Mr. Zoha hailed from one of the distinguished Syed families of Bihar (India) known for their religious piety and literary tradition. He was born in one of the suburbs of Patna and received his early education in Muzaffarpur where his father practised law. After passing his High School Examination in 1940 Zoha joined Patna College from where he obtained his B.A. degree in 1944. The literary taste that he possessed as a part of his family background was further refined and stimulated by his close association with some of the established scholars of Urdu literature working at Patna College. He grew into a gifted poet and his first poem was published during his college days.

However, his interest in geography seems to have prevailed supreme, for after his B.A. he decided to pursue higher studies in geography which was one of his main subjects of study at college level. Hence in the pursuit of learning he came to Aligarh Muslim University, the then Eldorado for geographical studies in the subcontinent. Here he got a chance to work with Professors Kazi S. Ahmad, Tahir Rizvi and late S. Muzaffar Ali. He completed his M.A. from this University in 1946 and after staying for a few months in Bihar, Zoha came to Karachi. Here, after the establishment of Pakistan, for a very brief period, he did some journalistic work as a columnist for 'Dawn' a leading newspaper of the country. In 1948

he went to Quetta and joined Government College as a lecturer in Geography. There he managed the college classes from first year to fourth single handed and through his devotion and interesting lectures, he made geography one of the most popular subjects among students. Here again inspired by the calm and serene atmosphere of Quetta and natural beauty of its surroundings he wrote several poems, especially sonnents, which earned him a place among the high ranking modern poets. Such literary interests, however, did not come in the way of his scientific endeavours. Intrigued by the physical landscape of Baluchistan Zoha wrote articles entitled, "Physiographic Personality of Baluchistan" which appeared (in two instalments) of *Pakistan Geographical Review*, Vol. VII, Numbers 1 and 2.

In the meantime he came in contact with Baba-i-Urdu Maulvi Abdul Haq who was concentrating his efforts on securing a respectable place for Urdu in national life. Baba and his associates were convinced that Urdu as the medium of instruction for higher education cannot only replace English but it

could also play an important role in developing national consciousness and solidarity. They had established Urdu College for testing such ideas. Impressed with Mr. Zoha's background, fine literary taste (particularly with his writings in Urdu), scientific bent of mind, and creative works, Babai Urdu and Mr. Aftab Hasan (the then Principal) offered him a post in Urdu College as Lecturer in Geography.

Thus from Quetta, sacrificing the benefits of Government Service, he came back to Karachi and joined Urdu College in 1954. It is here where I came in closer contact with him and became intimate friends. During his stay in the college he made positive contribution to promoting the cause of Urdu as an effective medium of instruction and also to the cause of geography, by making it more interesting through his lectures with literary flavour.

In 1957 Professor I. R. Khan, the then Head of the Department of Geography of the University of Karachi, secured his services for the Department. His literary taste coupled with clarity of thought and the depth of knowledge soon earned him fame as a great teacher. His main interest was in Historical Geography and Asia.

Again, Mr. Aftab Hasan, who had now become Director of a newly established Bureau of Publication of the University of Karachi, persuaded him to join the Bureau as its Assistant Director. He joined, although reluctantly, the Bureau and served it till he breathed his last. Here, he was in charge of translation, editing and production of the Text-books as well as books of scholarly standards. His versatility, devotion to duty and hardwork and charming manners made him extremely popular among his university colleagues. The Vice-Chancellor of the University, Dr. Ishtiaq Husain Quraishi, in his own books, published by the Bureau, has acknowledged Mr. Zoha's able performance. His services to this Bureau must be written in red letters. He was a principal member of the committee on translation of geographical terms instituted by the Bureau. He was editing the Urdu version of *Anglo-America* by White and Foscue which he leaves unfinished. He also worked for several years as Associate Editor of *Jadid Science* a leading scientific journal in Urdu published by the scientific society of Pakistan.

Despite his association with the Bureau of Publication he remained faithful to Geography. Even for his poems he would select topics of geographical interest. His poem, "Kanar-i-Bahr-e-Arab" (The Shore of the Arabian Sea) is his master piece in this respect. During his stay in Quetta his interest in the historical geography of Baluchistan was aroused and after joining the University of Karachi he started working more actively on this project. In order to use place names as a tool in this study he took a special training in linguistics. This training combined with his knowledge of Arabic, Persian and Turkish languages helped him a great deal in carrying out his proposed study. He had begun writing and the first drafts of two chapters were ready when he fell ill and was unable to recover again. On the basis of what he discussed with me, I am sure the study would have made significant contribution to the knowledge as well as the philosophy of the subject. Let us hope that some one completes this unfulfilled mission of the departed soul.

Mr. Zoha is survived by his wife, two sons and two daughters. Every one who has met him will always cherish his memory.

IQTIDAR H. ZAIDI

University of the Punjab

ڈاکٹر قاضی عبدالقادر☆

ش۔ضحیٰ صاحب

قیام پاکستان کے ابتدائی برسوں میں ہر چند ماہ بعد نئے اردو ادبی رسالوں کا جاری ہونا تقریباً ایک معمول سا بن گیا تھا۔ دو چار اشاعتوں کے بعد ان رسالوں کا سانس اکھڑنے لگتا، دو چار ماہ اور گھسٹتے رہنے کے بعد یہ رسالے دم توڑ دیتے۔ کالجوں میں پڑھنے والے نوجوان ان رسالوں کی تلاش میں رہتے۔ ان میں چھپنے والے مضامین، افسانوں اور غزلوں پر بحث اور کج بحثی ہوتی۔ کچھ سمجھ میں آتا کچھ نہ آتا، البتہ نئے ادبی ناموں اور کارناموں سے کان آشنا ہو جاتے۔

اسی ماحول میں ''ماہِ نو'' شائع ہوا۔ سرکاری پرچہ ہونے کے باعث اچھا نکلا، اس میں ایک بار ایک کالمی سانیٹ شائع ہوا، سانیٹ کا نام تو ہم انگریزی کی کلاسوں میں سن چکے تھے، جن کے بارے میں ہمیں یہ خبر تھی کہ شیکسپیئر لکھا کرتے تھے، جس طرح میرا بائی بھجن گاتی ہیں (یہ اطلاع ہمارے ہندی اور سنسکرت کے کشمیری استاد پنڈت شاستری جی نے دی تھی)، اس کے علاوہ سانیٹ کے بارے میں کچھ زیادہ معلوم نہ تھا اور نہ یہ معلوم تھا کہ سانیٹ پہلے بھی اردو میں لکھے گئے ہیں۔ میری تو اردو بھی واجبی سی تھی اس کی شاعری سے کیسے واقفیت ہوتی؟

بہر حال اردو رسالے میں سانیٹ کا لفظ پڑھ کر یہی خیال ہوا کہ انگریزی ہمارے ادب میں اسی عنوان سے نظر آنے لگے گی۔ دو چار احباب اور بڑوں نے جب سانیٹ کی تعریف کی تو اپنی تنقید اپنے تک ہی رکھ لی، لیکن ش۔ضحیٰ کا نام سانیٹ کے ساتھ ایسا وابستہ ہوا کہ دونوں کو ایک دوسرے سے جدا نہ کیا جا سکا۔

یہ غالباً ۵۴۔۵۵ کی بات ہے جب ایک بار اردو کالج گیا، اردو کالج اس زمانے میں سول اسپتال کراچی کے عقب میں ایک عمارت کے دو حصوں میں ہوا کرتا تھا، عمارت کا تیسرا حصہ مولوی عبدالحق کی رہائش اور انجمن کی خصوصی لائبریری اور انتظامیہ کے دفتر کے تحویل میں تھا۔ کالج کے شعبۂ طبیعات سے ملحق ایک نہایت ہی تنگ سے بیلنس روم میں کئی احباب کے درمیان ایک اجنبی شخص کو دیکھا۔ کسی صاحب نے کہا یہ ہیں ش۔ضحیٰ، ان سے ملو تو پہلا جملہ جو زبان سے ادا ہوا ''سانیٹ والے؟'' جواب میں زوردار قہقہہ سننے کو ملا۔

☆شمیم ٹاورس، یسین آباد، کراچی

بلند پیشانی، روشن چمکدار آنکھیں، چشمہ، نہایت عمدہ سلا ہوا سوٹ زیبِ بدن، ہاتھ میں سگریٹ اور سامنے چائے کی پیالی۔ ضیٰ صاحب کا یہ تعارفی خاکہ تھا اور اس خاکے میں دنوں، ہفتوں اور برسوں کے ساتھ رنگ آمیزی ہوتی گئی، اتنے رنگ اور اتنی جہتیں کہ کس کس کو شمار کیا جائے۔

میں ڈھاکہ سے کراچی آیا ہوا تھا، ایک دن وعدہ کر بیٹھا کہ ان کی شاعری پر مضمون لکھوں گا۔ خوشی کا اظہار کیا، مگر میں کچھ لکھ نہ سکا۔ انسان سامنے ہوتا ہے تو اس پر جو لکھو، مصلحتوں میں ڈھل کر کھوٹا سکہ ہو جاتا ہے۔ صرف موت اور نسیان ہی ہماری مدد کو آتے ہیں۔ موت انسان کی زندگی کا حساب بے باق کر دیتی ہے۔ گویا آپ کا کھاتا بند ہو گیا۔ اس میں کوئی رقم اب جمع نہیں ہوگی، اور نسیان وقت کو منجمد کر دیتا ہے۔ چند باتیں اور چند یادیں اثاثہ بن کر رہ جاتی ہیں۔ جانے والا یہی اثاثہ چھوڑ جاتا ہے۔

جب ضیٰ صاحب اردو کالج سے وابستہ ہوئے تو اس کا ماحول علمی اور حقیقی معنوں میں تعلیمی اور ایک حد تک مجاہدانہ تھا۔ پڑھنے والے اور پڑھانے والے دونوں ہی علمی لگن رکھتے تھے اور اپنے کاموں اور ذمے داریوں میں مگن رہتے تھے اور اپنے فنون میں اعلیٰ مقام رکھتے تھے اور پہچانے جاتے تھے، تاریخ میں ڈاکٹر معین الحق، سیاسیات میں حسان صاحب، اردو میں ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں، حبیب اللہ غضنفر، فلسفہ و نفسیات میں پروفیسر آشکار حسین، عربی میں مولانا مظہر علی کامل، فارسی میں عبدالرشید فاضل۔ یہ وہ لوگ تھے جو عام معنوں میں استاد نہیں بلکہ صاحبِ تصنیف تھے، اس علمی اور تعلیمی ماحول میں ضیٰ صاحب نے جلد ہی اپنی حیثیت منوالی۔ وہ بہت اچھے استاد تسلیم کر لیے گئے۔ طلبا ان کو گھیرے رہتے، انھیں غصہ آتا اور طلبا ان کی ڈانٹ سننے ہی ان کے پاس جاتے اور خوش خوش واپس ہوتے۔ رفقائے کار میں ان کی بذلہ سنجی، اور تیز فہمی مشہور تھی۔ البتہ میری اردو پر وہ معترض ہوتے، ان کے لہجے پر میں جملے کستا۔

ایک بار ایک کتاب ترجمہ کے لیے میجر آفتاب حسن کے پاس آئی، آفتاب صاحب کیمیا کے آدمی تھے، پچھلی صدی کی تیسری دہائی میں یونی ورسٹی کالج، لندن سے فارغ التحصیل ہوئے اور حیدرآباد دکن میں تدریسی اور تعلیمی انتظامیہ سے وابستہ ہو گئے۔ صاحبِ طرز نثر نگار اور تاریخ سائنس کے ماہرین میں سے تھے۔ قیامِ پاکستان سے قبل ان کی تصانیف آ چکی تھیں، پاکستان کے قیام کے بعد کاکول اکادمی میں تدریسی فرائض انجام دیتے رہے اور وہیں سے اردو کالج میں آئے اور پرنسپل مقرر ہوئے۔ کتاب جو ترجمہ کے لیے آئی تھی وہ لینسلائٹ ہوگبن کی تھی اور ''سائنس سب کے لیے'' کے نام سے شائع ہوئی۔ حقیقتاً یہ ضیٰ صاحب کا ترجمہ تھی، تقریباً ایک ہزار صفحات کی تحریر تھی، اس میں سعید (ڈاکٹر سید محمد احمد سعید)، کمالی (عبدالحمید کمالی) اور منظور (ڈاکٹر منظور احمد) نے بھی ترجمے کے جوہر دکھائے تھے۔ آفتاب صاحب نے پیش لفظ میں ان سب کا شکریہ ادا کیا تھا۔ میرا ذکر اس میں نہیں تھا۔ ضیٰ صاحب نے مزہ لیتے ہوئے آفتاب صاحب کے سامنے کہا، ''قادر کی حق تلفی ہو رہی ہے، دو چار سطروں کا ترجمہ تو اس بیچارے نے بھی کیا ہے'' اور اس کے بعد مسکرائے اور میری طرف دیکھتے ہوئے کہا، ''یہ جدا بات ہے کہ

ترجمہ غلط سلط ہی کیا ہو' اوراس کے بعد ان کا قہقہہ بلند ہوا۔

وہ اپنی بات ضرور کہتے اور مخاطب کے عہدہ اور مرتبہ سے قطع نظر کر کے کہتے اور بات اس پیرائے میں کہتے کہ کسی پر گراں نہ گزرے۔ پچھلی صدی کی چھٹی دہائی کی بات ہے کراچی یونی ورسٹی کے شعبۂ تصنیف و تالیف نے نئی تصانیف کی اشاعت کا پروگرام بنایا۔ میں ان دنوں ڈھاکہ یونی ورسٹی سے وابستہ تھا۔ آفتاب صاحب اس وقت شعبۂ تصنیف کے سربراہ تھے، انھوں نے جدید منطق پر کوئی کتاب ترجمہ کرنے یا تصنیف کے بارے میں دریافت کیا۔ میں نے عرض کی، منطق کی جس کتاب کا ذکر کیا ہے وہ انیس سوتیس (۱۹۳۰ء) میں شائع ہوئی ہے۔ اب منطق کی تدریس بدل گئی ہے اور منطق اب بہت زیادہ ریاضیاتی ہوگئی ہے۔ اس مضمون کی تدریس کے لیے نئے تصورات اور فنی تکنیک کو پیشِ نظر رکھنا ہوگا۔ آخر طے ہوا کہ جدید اشاری منطق (سمبولک لاجک) پر کتاب تحریر کی جائے۔ دو سال میں کتاب تیار ہوئی لیکن دفتری ضابطہ کے تحت اس کی اشاعت کے لیے ماہرانہ رائے کی ضرورت تھی۔ اس سلسلے میں شعبۂ فلسفہ کے ایک استاد کو بحیثیت مبصر مقرر کیا اور ان سے ماہرانہ رائے حاصل کی۔ ان حضرت نے جو ریاضیاتی منطق کی الف، بے سے بھی واقف نہیں تھے، تین جملوں میں کتاب کا لائق اشاعت کی سند دے دی، لیکن ان کا اصرار تھا کہ مصنف کے نام کے ساتھ ان مبصر کا نام بھی آئے۔ خود میجر آفتاب حسن صاحب جو شعبۂ تصنیف و تالیف کے سربراہ تھے، انھوں نے بھی ہاں میں ہاں ملائی، اوراس میں انھیں کوئی قباحت بھی نظر نہ آئی۔ جیسا ابھی عرض کیا، میں ان دنوں ڈھاکہ یونی ورسٹی سے وابستہ تھا اور ایک ہزار میل دور کراچی میں شعبۂ تصنیف و تالیف میں، جو مقامی سیاست چل رہی تھی اس سے واقف نہیں تھا۔ مگر ضمیؔ صاحب نے ان مبصر صاحب کی بات نہیں مانی۔ مبصر صاحب سے قریبی مراسم ہونے کے باوجود انھوں نے سرورق پر سوائے میرے نام کے کسی اور کا نام نہ آنے دیا۔ وہ مراسم کی اہمیت سے واقف تھے۔ دفتری اونچ نیچ ان کے لیے نئی بات نہیں تھی۔ لیکن اصولوں سے روگردانی کے وہ قائل نہیں تھے، نہ ہی کسی کی حق تلفی برداشت کر سکتے تھے۔ ۱۹۶۵ء میں پشاور یونی ورسٹی سے وابستہ ہوا تو شاری منطق (Symbolic Logic) پر یہ کتاب ۱۹۶۵ء میں شائع ہوئی۔

ضمیؔ صاحب اعلیٰ درجے کے شاعر تو تھے ہی، وہ بہت عمدہ نثر نگار بھی تھے۔ انھیں اصطلاح سازی کا فن آتا تھا۔ جامعہ کراچی کے شعبۂ تصنیف و تالیف نے اصطلاح سازی کی کم و بیش ایک درجن مجالس قائم کر رکھی تھیں۔ ان مجالس میں ڈاکٹر محمد محمود احمد، مولانا مظہر علی کامل، مولانا منتخب الحق، پروفیسر قاضی اسلم، ڈاکٹر ابواللیث صدیقی اور چند دوسرے اصحاب اور متعلقہ مضمون کے ماہرین ان مجالس میں شریک رہتے۔ زبان، لسانی اصولوں اور متعلقہ مضمون کی وضاحتوں میں الجھتے رہتے۔ میں جب کبھی ڈھاکہ اوراس کے بعد پشاور سے کراچی آتا تو ان مجالس میں شریک ہو جاتا۔ دراصل اصطلاح سازی کی ان مجالس سے میرا تعلق پرانا تھا۔ ابھی یونی ورسٹی میں شعبۂ تصنیف کا قیام بھی عمل میں نہ آیا تھا، غالباً ۱۹۵۴ء کی بات ہے، جب میجر آفتاب صاحب نے مجھے یاد کیا، میں یونی ورسٹی میں زیرِ تعلیم تھا۔ مجھے کہا گیا کہ تم نفسیات اور قریبی متعلقہ مضامین کی

اصطلاحات کو وضع کرنے اور جمع کرنے کا کام شروع کرو۔ میں نے ڈریورز کی ڈکشنری آف سائیکولوجی حاصل کی اور کام شروع کر دیا۔ دو سال میں انگریزی حرف P تک پہنچا تھا کہ اعلیٰ تعلیم کے لیے انگلستان چلا گیا، لیکن اپنا مسودہ اور اس کی فائل آفتاب صاحب کے سپرد کر دی۔ انگلستان سے واپسی پر معلوم ہوا کہ کام وہیں کا وہیں ہے جہاں دو سال قبل چھوڑ کر گیا تھا۔ اب تک یونی ورسٹی میں شعبۂ تصنیف و تالیف قائم ہو چکا تھا اور وضع اصطلاحات کی مجالس بھی قائم ہو چکی تھیں۔ نفسیات کی مجلس میں ڈاکٹر حسین الدین زبیری، سید محمد احمد سعید، منظور احمد، عبدالحمید کمالی اور پروفیسر قاضی اسلم شامل تھے۔

انگلستان سے واپسی پر مجھے فلسفے کی مجلس کا بھی رکن بنا دیا گیا۔ ایک دن آفتاب حسن صاحب اور ضحیٰ صاحب سے میں نے کہا کہ اصطلاح سازی کی ان مجلسوں میں کام کم ہوتا ہے، باتیں زیادہ ہوتی ہیں تو آفتاب صاحب نے کہا کئی احباب کی شرکت سے چہ میگوئیاں ختم ہو جاتی ہیں۔ ان کی شرکت حقیقتاً لوگوں کے منہ بند رکھنے کا بہانہ ہے، ورنہ کام تو ایک ہی کرتا ہے، وہ جس کو اس کام کی لگن ہو۔ دراصل مجھے اس بات کا احساس اس سبب سے ہوا تھا کہ بعض بظاہر بہت ثقہ حضرات بھی ان مجلسوں میں دلچسپی کم لیتے تھے لیکن نشست کے بعد جب ان کو اعزازیہ پیش کیا جاتا تو رقم وصول کر کے جیب میں رکھتے اور کہتے ''یہ دس روپے برے تو نہیں''، ضحیٰ صاحب بھی گفتگو میں شریک تھے، انھوں نے میری بات سن کر کہا کام علمی ہو یا تحقیقی، اس کی انفرادیت آپ کے حوصلے اور تخلیقی پہنچ پر قائم ہے۔ دوسروں کو ساتھ لے کر چلو اور اگر وہ راستے میں چھوٹ جائیں اور راہ بدل لیں تو افسوس نہ کرو، دیکھو کہ خطا کس کی ہے، تمھاری ہے تو اس کی صلاح کر لو۔ ضحیٰ صاحب کی کامیابی کا یہی راز تھا۔ وہ لوگوں کو ساتھ لے کر چلنے کے قائل تھے۔

ڈھاکہ یونی ورسٹی میں، کراچی یونی ورسٹی کی طرح سائنسی اور علمی وضع اصطلاحات اور ترجمہ کی کمیٹی قائم کی گئی تھی جس کے سربراہ پروفیسر علی احسن تھے، یہ کراچی یونی ورسٹی کے ڈاکٹر علی اشرف کے بھائی ہوتے تھے اور کراچی یونی ورسٹی سے ایک زمانے میں ان کا تعلق تھا۔ میں بھی ایک کمیٹی کا رکن منتخب ہوا، یہ نفسیات کی اصطلاحات کی کمیٹی تھی۔ جب ضحیٰ صاحب کو بتایا کہ ڈھاکہ میں اسی نوعیت کا کام شروع ہوا ہے جو یہاں کراچی میں ہو رہا ہے تو بہت خوش ہوئے، مجھ سے کہا کہ علی احسن صاحب سے کہوں اگر کسی مرحلہ پر ضحیٰ صاحب کی ضرورت ہو تو بخوشی مدد کو تیار ہیں۔ میں نے ضحیٰ صاحب کو وہاں کی مشکلات سے آگاہ کیا اور انھوں نے چند ہی دنوں میں ایک تفصیلی خط ڈاکٹر علی احسن کے نام روانہ کیا۔ میں جب ڈھاکہ پہنچا تو ڈاکٹر علی احسن نے بتایا کہ ضحیٰ صاحب کا خط پہنچا ہے اور لکھا ہے کہ عام طور پر اصطلاحات صرف علمی حلقوں میں محدود رہ جاتی ہیں لہٰذا اپنے ساتھ ان لوگوں کو بھی شامل کریں جو عام لوگوں تک ان اصطلاحات کو لے کر جائیں۔ انھوں نے اخبار سے وابستہ حضرات کو ان کمیٹیوں کا رکن بنانے کا مشورہ دیا تھا جو ڈھاکہ میں پسند کیا گیا۔

لیکن میرا خیال ہے مقامی سیاست نے وہاں بھی کام کیا، اصطلاحات کے ساتھ ساتھ اہم کتابوں کے ترجمے کا کام بھی شروع کر دیا گیا۔ روسی فزیالوجسٹ پیف لوف (Pav Lov) کی Reflexes پر کتاب امین الاسلام کو دی گئی، جو میں نے

کراچی یونی ورسٹی سے منگوا کر ترجمہ کرنے کو دی لیکن یہ کام نہ ہوسکا، امین الاسلام نے خودکشی کر لی۔ بات تقریباً پچاس سال کی ہوگئی، ضحیٰ صاحب نے، میں نے بنگلہ کی ادبی اور علمی فضا میں جو پودے لگائے تھے، کیا وہ پھل، پھول لے کر آئے، اس کے بارے میں پوچھنا پڑے گا۔

میں جب کبھی ڈھاکہ یا اس کے بعد پشاور سے کراچی آتا ان مجالس کی نشستوں میں شریک ہوتا۔ ضحیٰ صاحب دور اپنی میز پر کام میں مصروف رہتے۔ مسکرا مسکرا کر ہم لوگوں پر، کمیٹی کے ممبران پر نظر ڈالتے اور جب ان کو احساس ہونے لگتا کہ ہم اپنی بحثوں سے باہر آنے کو تیار نہیں تو اپنی میز سے اٹھتے، اپنا آلۂ سماعت کا بٹن دباتے اور ہنستے جملے کستے ہم لوگوں میں شریک ہو جاتے اور کوئی عمدہ راہ بتا کر ہی اٹھتے۔

کراچی یونی ورسٹی میں ترکی زبان کی تدریس شروع ہوئی تو ضحیٰ صاحب نے داخلہ لیا اور باقاعدگی سے یہ زبان سیکھی۔ اپنی کوششوں سے مالائی زبان سے واقفیت حاصل کی۔ انگریزی بہت اچھی لکھتے تھے۔ ہسپانوی زبان سیکھی۔ کہتے تھے کہ ہم لوگوں کو پرتگیزی زبان سے بھی واقفیت ہونی چاہیے کہ اردو زبان کے ''ڈانڈے'' اس زبان سے بھی ملتے ہیں۔ میں نے کہا یہ آپ لوگ رشتے ناطوں میں ''ڈنڈوں'' کا ذکر کیوں کرتے ہیں؟ ضحیٰ صاحب نے کہا، تم بتاؤ، میں نے عرض کیا کہ ''یہ آپ لوگوں کا فیوڈل انداز ہے، سوچ کا اور معاشرت کا، جو کام بھی ہو، ڈنڈوں کے زور سے ہو۔'' ضحیٰ صاحب بہت ہنسے، پہلے تو میری ہاں میں ہاں ملاتے رہے، پھر پہلو بدل کر کہنے لگے، ''ہر زبان میں حکمیہ جملوں کا اہتمام ہوتا ہے، لیکن اردو زبان دوستی اور محبت کی زبان ہے، دوستی اور مفاہمت نہ ہوتی تو یہ زبان وجود میں کیسے آتی؟ کچھ دیر بعد رک کر کہنے لگے، ''اردو شائستگی اور تہذیب کی زبان ہے، اس میں سخت بات کہنا مشکل ہے۔''

ایک دن کہنے لگے، ''وہ حضرات جو انگریزی کے دو چار الفاظ سیکھ لیتے ہیں، حکم چلانے کے لیے، غصہ اور نفرت کے اظہار کے لیے انگریزی ہی کا سہارا لیتے ہیں۔ ''شٹ اَپ'' اور ''ڈیم فول'' کے الفاظ ہمارے ہاں انھیں حضرات سے عام ہوئے۔ یہ درست ہے کہ ''ڈیم فول'' کا لفظ اب کم سنائی دیتا ہے اور ''شٹ اَپ'' کی جگہ ''بکواس بند کرو'' نے لے لی ہے لیکن سچ تو یہ ہے کہ اردو تہذیب اور شائستگی کی زبان ہے۔'' ضحیٰ صاحب اس کا مسلسل اظہار کرتے تھے۔

ایک بات جس کی طرف وہ اکثر توجہ دلاتے تھے وہ سترہویں، اٹھارویں صدی کے برطانوی معلمین اخلاق اور فلسفہ کی تحریریں تھیں۔ بشپ بارکلے جو آئرلینڈ سے تعلق رکھتا تھا، فلسفی بھی تھا اور کچھ عرصے تک اس کے ایک گرجا میں واعظ ہوا کرتے تھے۔ ضحیٰ صاحب ان کی تحریروں کا ذکر کرتے۔ ان کے خیال میں ان تحریروں میں علمی موضوعات پر زبان کو بوجھل کیے بغیر اعلیٰ علمی کام کیا گیا ہے۔ اردو بھی اس کی اہل ہے۔ اردو زبان، علمی بوجھ بغیر دشواری کے اٹھا سکتی ہے۔ لیکن یہ اسی وقت ممکن ہے جب کہ معاشرہ میں تہذیب اور شائستگی رچ بس جائے۔ اردو کی علمی تحریروں میں سماجی شعور اور شائستگی کا مزاج ہو تو اس کے وسیع تہذیبی اثرات مرتب ہوں گے۔ اس ضمن میں ضحیٰ صاحب اکثر اپنے قیامِ کوئٹہ میں بلوچستان پر لکھے گئے مضامین

کا حوالہ دیتے تھے اور یہ واقعہ ہے کہ جغرافیائی موضوعات پر ایسی عمدہ تحریر اور ایسی عمدہ زبان لکھنا، اس کا سلیقہ ضحیٰ صاحب کو ہی تھا اور یہ صرف اپنی زبان سے اور اپنے علمی موضوع سے واقفیت ہی نہیں تھی بلکہ زبان کے تہذیبی ماحول سے کام آگاہی اور اس سے وابستگی تھی جس نے انھیں ایسا عمدہ نثر نگار بنا دیا۔ ساٹھ کی دہائی میں بی اے کے نصاب میں تاریخِ سائنس کی ایک لازمی مضمون کے طور پر تدریس شروع ہوئی۔ ہمارے ملک میں اس وقت بھی ایسے حضرات کم تھے جو اس مضمون پر بے تکلف گفتگو کر سکتے تھے۔ اس میں تاریخِ سائنس ہی نہیں تھی بلکہ اس میں کچھ فلسفے کا دخل بھی تھا، یہ دراصل انگلستان کی تجربی فکر کا پرچار تھا اور یہ بتانا تھا کہ عصری سائنس کس طرح برطانوی سوچ کی پروردہ ہے۔ سائنس کے اساتذہ نے یہ مجبوری تدریس کا آغاز کیا لیکن ان کو تاریخِ سائنس اور اس کے فلسفیانہ اور ثقافتی داعیات کا اندازہ نہیں تھا۔ میں نیا نیا انگلستان سے آیا تھا لیکن انگلستان جانے سے قبل، سائنٹفک سوسائٹی کا دو ماہی ''جدید سائنس'' کی ادارت سے وابستہ تھا۔ میجر آفتاب سائنس سے میری دیوانگی کو جانتے تھے، وہ مصوری، فلسفہ اور سائنس سے میری وابستگی ہی نہیں بلکہ دیوانگی سے خوب واقف تھے اور بالآخر یونی ورسٹی کے علاوہ چند کالجوں میں میرے لکچر ہونے لگے۔ میں ایک سال کے بعد ڈھاکہ یونی ورسٹی سے وابستہ ہو گیا۔ اب ضحیٰ صاحب کی تلاش ہوئی اور یونی ورسٹی میں اس مضمون کی تدریس ان کے سپرد ہو گئی۔ ضحیٰ صاحب نے یہاں بھی اپنے جوہر دکھائے۔ ان کے لکچروں کی شہرت ہوئی اور انھوں نے کئی درسی پارے تحریر کیے۔ زمین کی ساخت پر، اور اس کے علاوہ اجرام فلکی پر ان کی تحریریں آج بھی وہی تازگی رکھتی ہیں جو پچاس سال پہلے ان کی شناخت تھی۔

اسی زمانے میں جب ڈھاکہ یونی ورسٹی سے میں وابستہ تھا تو میرے کراچی میں قیام کے زمانے کے لیکچرس لاہور سے مرحوم قاسمی صاحب کے ''فنون'' میں ''سائنس اور ثقافت'' کے عنوان سے شائع ہوئے۔ میں چند دنوں کے لیے کراچی آیا تو ملتے ہی حملہ کیا ''میرے مضمون میں دخل دے رہے ہو؟'' میں نے کہا، ''حضرت آپ خود میرے مضمون میں داخل ہو گئے ہیں۔'' ہنسے اور سنجیدگی سے کہا، ''جمالِ ہمنشیں در من اثر کرد۔'' اس ہم نشینی میں کسی نے کسی سے کیا سیکھا اور کیا دیا، حسب دوستاں والی بات تھی۔

جب میں کراچی چھوڑ کر بنگلہ دیش جا رہا تھا، طلبہ اور احباب نے الوداعیہ کا اہتمام کیا۔ امداد نظامی جو اس وقت غالباً سال دوم کے طالب علم تھے۔ اب مشہور صحافی ہیں، انھوں نے مجھ پر ایک نظم کہی، میں منطق کی کلاس لیا کرتا تھا لیکن منظور شدہ نصاب سے قطع نظر کر کے جدید اشاری منطق اور ریاضی کے مسلمات سے بھی طلبا اور طالبات کو واقف کرانا چاہتا تھا۔ میرا خیال تھا کہ آئندہ دہائیوں میں ریاضیاتی منطق اور اس سے متعلق ٹکنالوجی کے بغیر کوئی کام نہیں ہو سکے گا۔ کمپیوٹر کا نام سنا تھا، دیکھا نہیں تھا، لیکن انگلستان میں میرے استاد پروفیسر فنڈلے اور ڈاکٹر ایشی ٹورنگ اس مشین سے واقف کرا چکے تھے۔ اشاری منطق اور ریاضیاتی منطق میں الفاظ کی جگہ اعداد اور اشارے لیتے ہیں۔ امداد نظامی نے اس کا لحاظ رکھتے ہوئے ایک جگہ کہا:

اشاروں سے تیشے چلاتے ہیں یہ
ریاضی کو منطق بناتے ہیں یہ

میں تو خیر بلک رہتی چلا گیا لیکن کالج کے شعبۂ فلسفہ کے اساتذہ کی "کارگزیوں" کو کراچی میں رہنے کا ایک نیا ڈھنگ سکھا دیا۔ ہوا یہ کہ پروفیسروں کے ایک بند میں ہر استاد پر بند کہا جائے۔ شعبۂ فلسفہ میں اس وقت چار مستند شعرا تھے۔ خواجہ آشکار حسین، تسلیم کاظمی، سید محمد احمد سعید اور عاشق بدایونی اور جلد ہی ان کے کہے ہوئے بند مشہور ہو گئے۔ اور یہ اشعار کالج کے دائرے سے نکل کر ایوب خان اور نواب کالاباغ سمیت ملکی سیاست دانوں کا احاطہ کرنے لگے۔ انہیں میں حقی صاحب پر ایک بند تصنیف ہوا۔ سعید نے ایک بند کہا۔ چند احباب قریب بیٹھے تھے انھوں نے اشعار سنے تو ان کے قہقہوں کو سن کر حقی صاحب چونکے۔ اپنی آمد سے سماعت درست کیا: "کہو، کیا کہا؟" انھوں نے فرمائش کی۔ ایک مصرعہ تھا۔ سننے سے بے نیاز، سنانے میں بے مثال۔ ان کو بہت پسند آیا پورا بند تھا:

سائنس کو اردو صنف بنانے میں بے مثال
پہلے کبھی رہے تھے، پڑھانے میں بے مثال
اب حال یہ ہے کہ زمانے سے بے نیاز
سننے سے بے نیاز، سنانے میں بے مثال

میں واسطہ کر یونی ورسٹی اور اس کے بعد پشاور یونی ورسٹی ہوتا ہوا، سات آٹھ سال بعد منتقلاً کراچی چلا آیا۔ کراچی یونی ورسٹی میں گھر ملا، اور حقی صاحب ایک گھر چھوڑ کر میرے پڑوس میں آ گئے۔ ہم اکثر ساتھ اپنے انتظامی اور تدریسی دفاتر میں جاتے۔ مجھے یاد نہیں کہ ہم نے کبھی تحریر و تحقیق کے علاوہ کسی اور موضوع پر گفتگو کی ہو۔ حاسد کی سیاست جو عموماً اب یونی ورسٹی کے گجر کا لازمی جز بن گئی ہے، حقی صاحب کو اس سے کبھی دلچسپی نہیں ہوئی۔ وہ چلتے پھرتے ایک آدھ چٹکتا ہوا جملہ کہا، ایک قہقہہ لگایا اور بات بدل دی اور کیا ہو رہا ہے؟ کہا اور اپنی تازہ مصروفیت یا میری تحریر و تحقیق کا ذکر چھیڑ دیا۔ البتہ ایک موضوع ان کے سامنے ضرور رہتا، اس کا ذکر میری والدہ کے سامنے کرتے، وہ میری انگلستان سے واپسی اور یونی ورسٹی میں میرے تقرر کے خلاف ایک مہربان کی حکمت عملیاں تھیں۔ میں نے جب کہا کہ یہ دس سال پرانے مردے کیوں اٹھائے جا رہے ہیں تو بگڑ کر کہتے: "حق سے انکار نہ کرو۔" میں کہتا: "انکارِ حق سے نہیں ہے لیکن خاموش رہنے میں کیا مضائقہ ہے۔" مخالفین کا جواب مخالفت سے نہیں ہوتا ہے، ایک لفظ "در گزر" بھی تو ہے، خاموش ہو جاتے۔

وہ بڑھتا ہوا شہر، راستوں کی مسافتیں اور کاروباری بندشوں کا بہت فکر کرتے۔ انہیں یہ احساس ہو چلا تھا اور عام طور پر درست تھا کہ شہر اور اس کی گلیاں وحشی جنگلوں میں بدلنے لگے ہیں اور اس کے بے شہریوں کو اپنے سماجی رویے بدلنے ہوں گے اور زندگی کی دوریاں کم کرنی ہوں گی۔

میری والدہ حقی صاحب کے بچوں کی دادی، میری بہن ان کی پھوپھی اور میری بیوی ان کی چچی تھیں اور یہ صرف الفاظ نہیں تھے بلکہ یہ الفاظ ان رشتوں کی طرف اشارہ کرتے تھے حقی صاحب ان کو رشتے کی تربیت اپنے بچوں کو دیتے تھے۔ اگر گھر میں کوئی خوشی کی بات ہوتی تو یہی احساس اور برعکس کو۔ بیٹے شوکت یا ثروت سے پہلا سوال ہوتا، "دادی کو اطلاع دی یا نہ دی۔" ان کے بچوں نے قرآن شریف میری والدہ اور میری بیوی سے پڑھا۔

ایک دن شام کو وقت تھا حقی ہاتھ میں چند کاغذات لیے میرے گھر آئے۔ کہا "چائے پلواؤ" میں نے کہا میرے گھر میں سب کو علم ہے کہ ممتاز صاحب (پروفیسر ممتاز حسین) اور آپ سے گفتگو بغیر چائے کے شروع نہیں ہو سکتی۔ چائے بھی آ جائے گی لیکن یہ بتائیے اس وقت آنا کیسے ہوا اور یہ ہاتھ میں کیسے کاغذات ہیں؟ اپنی وراثت کو ملازمت کا استعفیٰ دے رہے ہیں؟ کہنے لگے اتنی جلدی اپنی وراثت کو نہیں چھوڑوں گا۔ پھر کاغذات میرے ہاتھ میں دیتے ہوئے کہا "یہ دیکھو اپنے بھتیجے کا کارنامہ۔" میں چونکا کہ ثروت نے کیا حرکت کی ہے کہ حقی صاحب تشریف لائے ہیں۔ کاغذات کو دیکھا تو ایک پر ایک نظم اور دوسرے میں ایک کہانی تھی۔ اب جو حقی صاحب کی طرف نظریں اٹھا کر دیکھا تو حقی صاحب مسکرا رہے تھے۔ "تو بھائی مبارک ہو تمھارے بھتیجے صاحب تیرہ سے شعر بھی کہنے لگے ہیں اور افسانے بھی لکھنے لگے ہیں۔" حقی صاحب کے بیٹے ثروت قریب کھڑے تھے۔ حقی صاحب نے فخریہ کہا "قادر یہ میرا اپنا میرا نام روشن کرے گا۔" جب وقت میں حقی صاحب نے یہ بات کہی تھی، ثروت حقی ماشاء اللہ اب صاحب تصنیف بھی ہیں، شعر کہتے ہیں، ٹیلی وژن کے لیے اسکرپٹ لکھتے ہیں اور امریکہ میں رہ کر اردو ادبی زندگی سے وابستہ ہیں۔

ایک بات جو مجھے ہمیشہ حیران کرتی ہے کہ تقسیم سے قبل ہندوستان کے دو علاقوں میں اردو کی وسعت کے باوجود مسلم گھرانوں میں انگریزی زبان نے نمایاں مقام حاصل کیا۔ حیدرآباد دکن اور بہار۔ یہاں کے شرفا ایک طرف مشرقی تہذیب کے متوالا سمجھے جاتے ہیں تو ساتھ ہی دوسری طرف مغربی فکر اور تحریر و بیان میں ملک کے انگریزی داں طبقے میں کسی اعتبار سے پیچھے نہیں رہے۔ حقی صاحب کے گھر میں اس بات کو میں نے بالخصوص محسوس کیا۔ حقی صاحب جیسا کہ عرض کر چکا ہوں بہت اچھی انگریزی لکھتے تھے۔ ان کے والد ایک انگریزی پندرہ روزہ میں مستقلاً لکھتے تھے۔ ان کے بھائی انجم جہدی نہ صرف عمدہ شعر کہتے ہیں، نثر نگار ہیں، بہترین انگریزی لکھتے اور بولتے ہیں۔ حقی صاحب کے بھائی عسکری امام طبیعات کے استاد تھے اور ان کے لیکچروں کے بارے میں عام طور پر سننے میں آتا کہ اگر سائنس سے نوجوانوں کو پیار کرانا ہے عسکری کے ساتھ گر رہا ہو۔ مجھے یاد نہیں کہ عسکری شعر کہتے تھے کہ نہیں مگر انجم جہدی آج بھی شعر کہتے اور خوب کہتے ہیں۔

چالیس پچاس سال کی بات ہوگی، اس وقت کے کالجوں اور یونیورسٹی کے اساتذہ اپنے مخصوص مضمون میں اعلیٰ درجے کے ساتھ مسلم ہند کے ثقافتی ورثے کو اپنے سینوں سے لگائے رکھتے تھے۔ ان کی درسی تقریروں اور مضامین میں زندگی، علم اور حسن کا یہی امتزاج ہوتا تھا کہ تعلیم و تدریس ایک اعلیٰ ثقافتی اور جمالیاتی تجربہ ہو گیا تھا اور سائنس اور فنون میں اب جس دوری کا اور فاصلے کا ذکر ہم سنتے

گئے ہیں اس سے کام آشنا نہیں تھے۔ اساتذہ اور طلبا مختلف علاقوں سے وابستہ ہونے کے باوجود کسی ثقافتی انتشار کے شکار نہیں تھے۔ حقی صاحب کو اس علمی اور ادبی، بلکہ ثقافتی ماحول اور اپنی اعلیٰ علمی اور ادبی حیثیت کا احساس تھا۔ یہ ممکن نہیں تھا کہ ادب و شعر کی بات ہو رہی ہو اور ان کو خبر نہ ہو اور بات پہنچے تو اس پر ادبی ردعمل کا اظہار نہ ہو۔

ایک علمی، تحقیقی اور ادبی ماحول میں اپنا مقام بنانا آسان نہیں ہوتا، لیکن حقی صاحب نے اس ہمہ جہتی ثقافتی ماحول میں یہ مقام حاصل کیا۔ کالج میں اس زمانے میں طالب علموں میں اسلم فرخی، ابوالخیر کشفی، ... انتظار، ... سید محمد احمد سعید، ... شاعر ... شامل تھے۔ اساتذہ میں حبیب اللہ غضنفر، آغا افتخار حسین، ... ان میں حقی کا ادیب اور شاعر کا نمایاں مقام حاصل کرنا ان کی اعلیٰ علمی اور ادبی حیثیت کی سند ہے۔

۱۹۶۵ء کی جنگ کے وقت میں پشاور میں تھا، ہم لوگ جس میں یونیورسٹی کے اساتذہ اور طلبا ایئرپورٹ کی توسیع میں سب شریک تھے۔ پتھر اور اینٹیں لا کر رکھتے، ایک آن بان ... تھک کر گھر سیر ہی کرنے کا وقت ہوتا اور کام پھر شروع ہو جاتا۔ کام کی نگرانی فوجی ماہرین اور انجینئر کرتے۔ جنگ ختم ہونے سے قبل ایئرپورٹ کی توسیع تین گنا ہو گئی، جذبہ اور لگن ہو تو بڑے کام بھی چھوٹے ہو جاتے ہیں۔ جنگ ستمبر میں ہوئی، دسمبر میں کراچی آیا، حقی صاحب سے ملاقات ہوئی۔ انھوں نے اپنی تازہ نظم سنائی۔ کہنے لگے: "صبح کا وقت تھا، ایک دم احساس ہوا کہ آس پاس آگ لگی ہوئی ہے، بارود کی بو آرہی ہے، میں اٹھا لیکن مسلسل یہ احساس تھا کہ کوئی حادثہ ہوا ہے۔ میں پریشان تھا کہ یہ کیا ہو رہا ہے۔ اشعار بے تکلف زبان سے ادا ہو رہے تھے، چند گھنٹوں میں خبر پھیل گئی کہ جنگ چھڑ گئی ہے۔" میں نے خیال اور واقعے کے تعلق کا ذکر کیا۔ حقی صاحب نے ہاتھ کے اشارے سے مجھے منع کرتے ہوئے کہا، یہ بات فلسفہ کی نہیں ہے، اپنی مٹی سے پیار اور محبت کی بات ہے۔ اس کے بعد ملک اور ملک کے بٹتے ہوئے رنگ ڈھنگ کا ذکر کرتے ہوئے اپنی ایک نظم کا بند پڑھنے لگے:

ہم تو تھکے تھے کہ گل رہ میں چاہے
ہر سانس میں منزل کے سکوں تیز نشاں ہیں
گلگشت سحر پہ سرے چمن کے تھے
کانٹے کے آغوش میں ہم رنگ فضا ہیں
جو اپنی اجازت تو میں پوچھوں گا تم سے
تم کون ہو، میں کون ہوں؟ ہم لوگ کہاں ہیں؟

دوسری صدی آگئی۔ حقی صاحب کا کہا یہ مصرع آج بھی زبان پر آتا ہے تو خیال ہوتا ہے کہ کیا فاصلہ ہونا ہے جو طے نہیں ہوا۔